جلد (۱۰) عدد (۳)
ربیع الاول سنہ ۱۳۵۶ھ

رجسٹر نمبر آصفیہ ۱۲۰
رجسٹر نمبر ایم ۲۹۵۰

۷۸۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرانی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

قیمت سالانہ (صہ)

قیمت فی پرچہ (۸/)

الجہاد فی الاسلام

(تالیف)

ابوالاعلیٰ مودودی

اسلام کے جن مسائل پر مخالفین نے سب سے زیادہ حملے کئے ہیں اُن میں سے ایک مسئلہ جہاد بھی ہے اس مسئلہ پر ایسی شدومد کے ساتھ اعتراضات کیے گئے کہ بہت سے مسلمان بھی ان سے مرعوب ہو گئے اور انہوں نے دشمنوں کے اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے خود اسلام کے احکام اور اس کی تعلیمات میں قطع و برید شروع کر دی! اسلام کے حامیوں کی جانب سے اس مسئلہ پر جو کچھ لکھا گیا وہ سب معذرت Apology کے انداز میں تھا جس سے صریح کمزوری اور مرعوبیت ظاہر ہوتی تھی مولانا شبلی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد نے البتہ اس مسئلہ کو صاف کرنے کی کوشش کی مگر پورا پورا حق ان کی تحریروں سے بھی ظاہر نہیں ہوا۔ ضرورت تھی کہ ایک مفصل کتاب اس موضوع پر لکھی جاتی جس میں جنگ کے متعلق اسلام کی تعلیم اور اس کے مقاصد اور احکام کو تفصیل کے ساتھ صاف صاف بیان کر دیا جاتا، اور دوسرے مذاہب اور قوموں کے اصول و قوانین جنگ سے مقابلہ کرکے ثابت کیا جاتا کہ اسلام کا جہاد اپنے مقاصد اور قواعد و ضوابط کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

الجہاد فی الاسلام نے اسی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ یہ کتاب معذرت کے انداز میں نہیں بلکہ اظہار حق کے انداز میں لکھی گئی ہے اور ضمناً اس میں ہندو مذہب، بودھ مت، مسیحیت، یہودیت اور قانون بین الاقوام International law پر ایسے مباحث بھی آگئے ہیں جو ابھی تک اردو زبان کے لیے بالکل نئے ہیں عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ اس موضوع پر ایسی کوئی کتاب صرف اردو ہی نہیں بلکہ کسی مشرقی یا مغربی زبان میں نہیں لکھی گئی۔

ضخامت (۵۰۰) صفحات قیمت ... جلد (...) انگریزی (...) سکہ عثمانیہ (مجلد کی قیمت ... انگریزی ... سکہ عثمانیہ!

دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے (یہ کتاب مکتبہ علمیہ چارمینار سے بھی مل سکتی ہے)

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ جلد ۱۰ عدد ۳

دفتر ترجمان القرآن کو اس رسالہ کے حسب ذیل نمبروں کی ضرورت ہے۔ جو حضرات ان کو بقیمت نکالنا چاہتے ہوں وہ دفتر سے مراسلت کریں۔

محرم، شعبان، رمضان، ۵۲ھ۔

محرم، صفر، ربیع الاول۔ ربیع الثانی ۵۴ھ

منیجر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

کئی مہینے سے پرچہ مسلسل تاخیر سے شائع ہو رہا ہے۔ خریداروں کی شکایات جس قدر بڑھتی جاتی ہیں میری شرمندگی بھی اسی قدر بڑھ رہی ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ تاخیر کے جو اسباب ہیں اُن کا علاج میرے اختیار میں نہیں تاوقتیکہ رسالہ کے ہمدرد اور قدر شناس میری اعانت نہ کریں، میں ان مشکلات کو دفع نہیں کر سکتا جن کی وجہ سے اس کی زندگی خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ اگر یہ کوئی تجارتی رسالہ ہوتا اور میں نے اپنی ذاتی غرض کے لیے اس کو جاری کیا ہوتا تو بلاشبہ اس کو چلانے یا نہ چلانے کی ذمہ داری تمام تر میری ذات پر ہوتی۔ قوم کو یہ کہنے کا حق تھا کہ ہمیں تمہاری مشکلات سے کیا بحث۔ چیز اچھی دو گے اور وقت پر دو گے، خرید لیں گے، نہ دو گے نہ خریدیں گے۔ لیکن شائد یہ بات میں کسی خودستائی و انکسار کے بغیر کہہ سکتا ہوں کہ ترجمان القرآن سے میرا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں، بلکہ پوری قوم کا مفاد وابستہ ہے۔ گو اپنی حد تک میں اپنا فرض سمجھ کر ہی اس کو چلا رہا ہوں، اور اپنے آپ ہی کو اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، مگر کم از کم مجھے یہ کہنے کا حق تو ضرور ہے کہ جس طرح اس خدمت کو انجام دینا میرا فرض ہے، اسی طرح مجھے اس کی انجام دہی کے قابل بنانا قوم کا بھی فرض ہے۔ میں اپنے ان دوستوں اور ہمدردوں کا دل سے شکرگزار ہوں جنہوں نے رسالے کی اشاعت بڑھانے میں میری مدد کی ہے لیکن محض چند افراد کی کوششوں سے کیا ہو سکتا ہے۔ ضرورت تو اجتماعی کوشش کی ہے۔ اب ایسا وقت آگیا ہے کہ اگر اس پرچہ کو زندہ رکھنا ہے اور دنیا کو اس کی زندگی کی کوئی ضرورت محسوس کی جاتی ہے تو اس کے تمام ہمدردوں کو خاص طور پر توسیع اشاعت

کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ آئندہ پانچ مہینوں میں اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا ہے اگر خریدار کی تعداد میں کافی اضافہ نہ ہوا، تو میں عرض کیے دیتا ہوں کہ محض ساڑھے تین سو خریداروں سے اس معیار کے پرچے کو چلانا میری قدرت سے باہر ہے۔

اس رسالہ میں اب تک متعدد مضامین ایسے شائع ہو چکے ہیں جن کا محض ایک مرتبہ رسالہ میں شائع ہو جانا کافی نہیں، بلکہ انہیں مستقل کتابی صورت میں طبع کرنے اور کثرت سے پھیلانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر چند مضامین کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے جن کے عنوانات دیکھ کر ناظرین کو ان کی اہمیت یاد آجائے گی۔

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی۔

قومیت اسلام (فتنۂ وطن پرستی کا رد)

قرآن اور حدیث (فتنۂ انکار حدیث کا رد)

رسالت (ایمان بالرسالت کی اہمیت اور ان بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ جو رسالت کے باب میں پائی جاتی ہیں)

اسلام اور ضبط ولادت

عبادت

حقوق الزوجین

سود

پردہ

ان کے علاوہ اشارات کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے اگر اس کے بھی متعدد مجموعے مختلف عنوانات کے تحت مرتب کرکے شائع کیے جائیں تو یقیناً مفید ثابت ہوں گے۔ ممکن ہے کہ فروع میں کسی کو مجھ سے

اختلاف ہو۔ اور ایسا کون ہے جس کی ہر بات سے ہر شخص متفق ہو جائے، لیکن اصول کی حد تک میں سمجھتا ہوں کہ جن لوگوں نے مذکورۂ بالا مضامین کو پڑھا ہے وہ بالاتفاق تسلیم کریں گے کہ میں نے ایک صحیح اور متوسط راستہ کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی ہے، اور اسلامی تعلیمات کی تشریح و تفہیم میں وہ طریقہ اختیار کیا ہے جو افراط و تفریط سے پاک اور ضروریات زمانہ کے مطابق ہے۔ دورِ جدید کی گمراہیوں کے استیصال اور مسلمانوں کے بگڑے ہوئے نقطۂ نظر کی اصلاح اور ان کے اندر دین کی سمجھ اور عمل کی روح اور اطاعت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے ان مضامین کی اشاعت ضروری ہے، اور حالات جس قدر زیادہ بگڑتے جاتے ہیں اسی قدر یہ ضرورت بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ میں ایک مدت سے اس ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ مگر میری خواہش یہ تھی کہ مجھے خود اپنی قوت بازو سے اس کام کو انجام دینے کی توفیق میسر آجائے اور کسی سے مدد مانگنے کی حاجت نہ ہو۔ اسی انتظار میں مہینوں پر مہینے اور سال پر سال گزر گئے۔ اب دیکھتا ہوں کہ ایک طوفان عظیم مسلمانوں کے سر پر آپہنچا ہے، اور اس طوفان سے ان کا سلامت گزر جانا بغیر اس کے ممکن نہیں کہ ان کے اندر دین کی سمجھ اور طریق اسلام و طریق کفر و فسق کی تمیز پیدا کی جائے۔ اسی خطرہ نے مجھ کو اپنی ہٹ سے باز آجانے پر مجبور کر دیا ہے اور آج میں دلی کراہت کے ساتھ اس کام میں اپنی قوم کے دولتمندوں سے مدد مانگتا ہوں۔

اجتماعی مفاد کے لیے اجتماعی کوشش ناگزیر ہے۔ تنہا ایک شخص اپنی قوت اور اپنے ذرائع سے کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ خود ہمارے آقا و مولیٰ علیہ وعلی آلہ التحیۃ والسلام نے بھی تبلیغ دین اور جہاد فی سبیل اللہ میں اپنی امت سے مدد لی ہے۔ پس اگر ان کی ملت کا ایک خادم اسی کام کے لیے قوم سے مدد مانگے تو یہ کوئی عیب نہیں، لیکن جو چیز آج تک مجھ کو یہ طریقہ اختیار کرنے سے روکتی رہی، اور جس کی وجہ سے آج بھی میں اس میں کراہیت محسوس کرتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ ایک طرف قومی کارکنوں نے اپنی

حرکات سے نہ صرف اپنا بلکہ قومی خدمت کا بھی اعتبار کھو دیا ہے اور دوسری طرف آج کل مسلمانوں کے حوصلے پست اور اخلاق ان سے بھی زیادہ پست ہو گئے ہیں۔ اول تو خدا کی راہ میں صرف کرنے کا خالص جذبہ ہی ان میں برائے نام باقی رہ گیا ہے۔ پھر اگر وہ اس راہ میں کچھ نکالتے بھی ہیں تو دل کی تنگی ان کے نفس میں ہزار قسم کی بدگمانیاں پیدا کرتی ہے اور اس پر اخلاق کی یہ حالت ہے کہ اپنے ایک بھائی کو بے ایمان، خائن، چور کہہ دیتے ہیں اور ان کو ذرا تامل نہیں ہوتا۔ پچھلے چند برسوں میں پبلک فنڈ سے کام کرنے والوں کی جو رسوائیاں ہو چکی ہیں ان کا حال اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہوں ایسی حالت میں کسی عام چندہ کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے میری روح کانپتی ہے۔ مگر چونکہ کام ضروری ہے اور وقت کا تقاضا شدید ہے اس لیے بڑے تأمل اور کافی غور و خوض کے بعد میں نے ایک تجویز سوچی ہے اور اس کو یہاں بیان کیے دیتا ہوں۔

تجویز یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے ناظرین میں سے جو اصحاب ذی استطاعت ہوں وہ اس مد میں صرف سو سو روپے یکمشت دے دیں۔ اگر پچیس تیس آدمی بھی ایسے نکل آئیں تو ڈھائی تین ہزار کی رقم جمع ہو سکتی ہے جس سے مذکورۂ بالا رسائل بآسانی طبع کرائے جائیں گے۔ ان رسالوں کی قیمت لاگت سے دس فی صدی زیادہ رکھی جائے گی اور ان کی فروخت سے جو کچھ وصول ہوگا اس کو انہی رسالوں کی دوبارہ اشاعت اور ایسے ہی دوسرے رسالوں کی اشاعت کے لیے مخصوص رکھا جائیگا۔ نہ میں خود اس کو استعمال کروں گا، نہ ترجمان القرآن میں صرف کروں گا۔ تمام حسابات باقاعدہ رکھے جائیں گے اور ہر تیسرے مہینے یا چھٹے مہینے معطی صاحبان کے پاس بھیج دیے جائیں گے۔ کسی معطی کا نام شائع نہ کیا جائے گا۔ اس لیے کہ مسلمان کی خیرات کا اشتہار دینا دراصل اس کے روپے کو ضائع کرنا ہے اور ایسے بذل مال میں کوئی برکت بھی نہیں ہوتی جس میں ریا اور نمائش کا جذبہ شامل ہو جائے۔ صرف

وہی حضرات اس کام میں حصہ لیں جو محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے طالب ہوں اور آخرت کے ثواب کا یقین رکھتے ہوں چھوٹے چھوٹے متفرق چندے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیے جائیں گے، اس لیے کہ میں معطیوں کی تعداد محدود رکھنا چاہتا ہوں پچیس تیس آدمیوں کو حساب بآسانی دے سکوں گا مگر ہزار آدمیوں کو حساب دینا میرے بس کا کام نہیں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو لاگت سے دس فی صدی زیادہ قیمت رکھنے پر اعتراض ہو' لہٰذا رفع شکوک کے لیے یہ عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ ترجمان القرآن میں ابھی اور بہت سے مضامین شائع ہونے والے ہیں جو نہایت اہم مسائل سے تعلق رکھتے ہیں۔ عنقریب ایک مضمون کا سلسلہ شروع ہونے والا ہے جس میں کمیونزم پر مفصل تنقید ہوگی اور اصول اسلام سے اس کا تقابل کیا جائے گا۔ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی کی تکمیل بھی کرنی ہے۔ اب تک اس کے صرف تین باب لکھے گئے ہیں۔ دو باب ابھی باقی ہیں اور وہ موجودہ زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں اسلام کے نظام اجتماعی کا نقشہ اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ پیش کیا جائے گا جس سے اسلامی زندگی کی پوری تصویر سامنے آجائے گی اور ایک ہی مرقع میں لوگ دیکھ لیں گے کہ یہاں اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، عدل وقانون، اور بین الاقوامی تعلقات کے مختلف شعبوں کو کس شکل میں کس طریقہ سے اور کس تناسب کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یہ اور ایسی ہی دوسری چیزیں جو آئندہ نکلنے والی ہیں، ان کی اشاعت کا بھی کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ بجائے اس کے کہ بار بار لوگوں سے اعانت کی اپیل کی جائے، میں زیادہ مناسب یہ سمجھتا ہوں کہ انہی رسالوں کی قیمت میں لاگت پر اتنا اضافہ کر دیا جائے کہ اس سے دوسرے رسالوں اور کتابوں کی اشاعت کے لیے سرمایہ بہم پہونچ جائے۔ اس طرح چند اشخاص پر زیادہ بار پڑنے کے بجائے بہت سے اشخاص پر تھوڑا تھوڑا بار پڑیگا، اور اس نشر وتبلیغ کا

سلسلہ وسیع کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں میں دین کے لیے ایثار و قربانی کا جو تھوڑا بہت جذبہ باقی ہے وہ مالداروں سے زیادہ غریبوں میں پایا جاتا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ شکایت کریں گے جو سو روپے دینے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ کہیں گے کہ تم اس سعادت کو مالداروں کے لیے مخصوص کرنا چاہتے ہو۔ اور ہمیں محض اس بنا پر محروم کر رہے ہو کہ ہم مالدار نہیں ہیں لیکن درحقیقت میں ان کو محروم کرنا نہیں چاہتا۔ ان کے لیے اس سعادت میں حصہ لینے کی ایک دوسری صورت ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہ حسب حیثیت ان کتابوں اور رسالوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں خرید کر قوم کے اُن طبقات تک پہنچانے کی کوشش کریں جن کی اصلاح مقصود ہے۔ میں دراصل ایک شفاخانہ قائم کر رہا ہوں۔ دینداروں میں سے جو مالدار ہیں وہ اس شفاخانہ کے قائم کرنے میں حصہ لیں۔ اور ان میں سے جو غریب ہیں وہ اس کی دوائیں مریضوں تک پہنچانے میں حصہ لیں۔ اصلی سعادت یہ ہے کہ آپ کے دل میں قومی امراض کے استیصال اور شفائے ربانی کے ایصال کا جذبہ ہو۔ آپ کا دل ایک ایسی ماں کا سا دل ہونا چاہیے جو اپنے بچوں کو بیمار دیکھ کر بے چین ہو جاتی ہے، اور ان کے علاج میں کسی امکانی کوشش اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ آپ جن لوگوں میں رہتے ہیں، جن سے ملتے جلتے ہیں، جن کے ساتھ آپ کو کسی نہ کسی طرح سابقہ پیش آتا ہے، ان میں دیکھیے کہ کون کون بیمار ہیں، اور کس کس مرض کے بیمار ہیں۔ جو شخص جس مرض میں مبتلا ہو اسی مرض کی دوا اس کو دیجیے۔ زندقہ و الحاد کا مریض ہو، اسے "اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی" پڑھائیے۔ وطن پرستی کا بیمار ہو، اس کو "قومیت اسلام" دیجیے۔ کمیونزم کا حملہ کسی پر ہو گیا ہو، اس کا علاج "سود" کے مضمون سے کیجیے۔ آزادی نسواں کی بیماری میں "پردہ" کی خوراک استعمال کرائیے۔ فرنگیت کے بیماروں کو "اشارات" کے مختلف مجموعے

دیکھیے غرض جتنی وبائیں آج کل آپ کی قوم میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو مٹانے پر کمربستہ ہو جائیے اور اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی محنت کا کچھ حصہ خدا کے دین اور اس کے رسول کی امت کے لیے بھی نکالیے کہ ان چیزوں پر محض آپ کے نفس ہی کا حق نہیں ہے بلکہ خدا اور اس کے رسول کا بھی حق ہے آپ خدا کے ثواب کی خواہش رکھتے ہیں تو خدا کا ثواب اتنا سستا نہیں کہ محض دس پانچ روپے دیکر خرید لیا جائے، اس کے لیے جہاد کی ضرورت ہے، اور جہاد یہی ہے کہ آج رسول اللہ کے گھر میں جو آگ لگ رہی ہے اس کو بجھانے کی کوشش کیجیے۔

ان صفحات میں اسلامی ہند کے مستقبل پر جو بحث شروع کی گئی ہے اس کا سلسلہ آگے بڑھانے سے پہلے ایک بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے مخاطب صرف وہی لوگ ہیں جو مسلمان کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتے ہیں۔ اور جن کی نگاہ میں زندگی کے تمام مسائل سے زیادہ اہم اور اقدم سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم اور باقی رہے، بلکہ اس کو عزت اور طاقت حاصل ہو۔ باقی رہے وہ لوگ جو وقت کے مسائل کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اور جن کی نگاہ میں مسلمان ہونا یا نہ ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا، اور جو سیاسی و معاشی فلاح کو دوسرے تمام مسائل پر مقدم رکھتے ہیں، تو وہ سرے سے ہمارے مخاطب ہی نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا ہم سے بحث کرنا بالکل فضول ہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان کوئی مشترک بنیاد نہیں ہے، وہ ایک جہاز کے مسافر ہیں۔ اور ہم دوسرے جہاز کے۔ ان کو صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے سیاسی آزادی اور معاشی استقلال کی ضرورت ہے، عام اس سے کہ مسلمان رہیں یا نہ رہیں بخلاف اس کے ہمارے لیے مسلمان رہنے کا سوال ہی اصل سوال ہے، اور ہندوستان کی آزادی ہم اس لیے اور اسی شرط پر چاہتے ہیں کہ وہ اس

سرزمین پر اسلام کی عزت قائم کرنے میں مددگار ہو۔ پس جو مسلمان سیاسی معاملات میں حصہ لے رہے ہیں ان کے درمیان سب سے پہلے یہی امتیاز قائم ہونا چاہیے کہ وہ ان دونوں راستوں میں سے کس راستے کے مسافر ہیں۔ جو لوگ "ہندوستانیت" کی راہ پر ہیں وہ اپنی راہ پر جائیں، ہمیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہم ان سے صرف اتنا کہیں گے کہ براہ کرم منافقت چھوڑ دو اور اپنی پوزیشن صاف طور پر ظاہر کر دو تاکہ کوئی دھوکا نہ کھائے۔ اور جو لوگ "اسلامیت" کی راہ پر ہیں وہ ہمارے ہم سفر ہیں ہماری اور ان کی منزل مقصود ایک ہے۔ معرض بحث میں صرف یہ سوال ہے کہ اس منزل کی طرف جانے کے لیے صحیح راستہ کونسا ہے۔ وہ جس راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اس کا صحیح ہونا ثابت کر دیں، ہم دل و جان سے اُن کے ساتھ ہیں۔ لیکن اگر وہ راستہ غلط ہے تو پھر اخلاص کا اقتضا یہ ہے کہ وہ اُس راستہ کی طرف آئیں جس کا صحیح ہونا ثابت کر دیا جائے کم از کم دین و ملت کے معاملہ میں مسلمان کے اندر نفسانیت اور کبر و عجب نہ ہونا چاہیے۔ کسی حق پرست کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی طریقہ پر صرف اس لیے اصرار کرے کہ وہ اُس پر چل پڑا ہے اور اب پلٹنے میں اس کی عزت (جھوٹی عزت) کو ٹھیس لگتی ہے۔

چند غلط فہمیاں تھیں جن کو دور کرنے کے لیے اس توضیح کو آج کی صحبت کا دیباچہ بنانا ضروری سمجھا گیا۔ اب ہم کو اس مقام سے چلنا ہے جہاں سے پچھلی صحبت کا سلسلہ منقطع ہوا تھا۔

ہماری منزلِ مقصود جیسا کہ اشارۃً اوپر عرض کر دیا گیا، صاف اور واضح طور پر یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام نہ صرف قائم رہے، بلکہ عزت اور طاقت والا بن جائے۔ آزادی ہند ہمارے نزدیک مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ اس اصل مقصد کے لیے ایک ضروری اور ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مقصود ہے ہم صرف اُس آزادی کے لیے لڑنا چاہتے ہیں، بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اپنے مذہب کی رو سے لڑنا فرض جانتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ ملک کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے۔

لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ یہ جیسا دار الکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بدتر ہو جائے تو ہم بلا کسی مداہنت کے صاف صاف کہتے ہیں کہ ایسی آزادی وطن پر ہزار مرتبہ لعنت ہے، اور اس کی راہ میں بولنا، لکھنا، روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا سب کچھ حرام، قطعی حرام ہے۔

یہ ایسی صاف بات ہے جس میں دو رائیں ہونے کی کوئی گنجایش ہی نہیں خصوصاً جو شخص قرآن اور سنت پر نظر رکھتا ہے اور منافق نہیں ہے وہ تو اس کے برحق ہونے میں چون و چرا نہیں کر سکتا۔

منزل مقصود کا انتہائی مقام یعنی ہندوستان کو کلیتہً دار الاسلام بنانا تو اتنا بلند مقام ہے کہ آج کل کا کم ہمت مسلمان اس کا قصد کرنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتا۔ خیر جانے دیجیے اس کو اس سے فروتر درجے میں جس مقصد کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے وہ کم سے کم یہ ہے کہ ہندوستان نہ تو بیرونی کفار کے تسلط میں رہے اور نہ اندرونی کفار کے کامل تسلط میں چلا جائے، بلکہ آزاد ہو کر شبہ دار الاسلام بن جائے۔

اب آگے بڑھنے سے پہلے اس بات کو سمجھ لیجیے کہ شبہ دار الاسلام سے کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص اس کے معنی یہ سمجھتا ہے کہ مسلمانوں کے سے نام رکھنے والوں کو اسمبلیوں اور کونسلوں کی نشستیں اور سرکاری عہدے مل جائیں اور ہندوستان کے معاشی ثمرات میں ان کو بھی متناسب حصہ ملے، اور آزاد ہندوستان کی تمام عمرانی ترقیات سے (خواہ وہ ترقیات کسی صورت میں ہوں) انھیں بلا امتیاز مستفید ہونے کا موقع ملے، تو ہم کہیں گے کہ وہ غلطی پر ہے یہ جس چیز کو شبہ دار الاسلام سمجھتے ہیں، اور جو چیز درحقیقت اس نام سے موسوم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت میں ہم محض "ہندوستانی" ہونے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "مسلمان" ہونے کی حیثیت سے حصہ دار ہوں، اور ہمارا یہ حصہ اس حد تک طاقتور ہو کہ:۔

(۱) ہم اپنی قوم کی تنظیم اصول اسلامی کے مطابق کر سکیں یعنی ہم کو حکومت کے ذریعہ سے اتنی قوت

حاصل ہو کہ ہم مسلمانوں کے لیے اسلامی تعلیم و تربیت کا انتظام کر سکیں، ان کے اندر غیر اسلامی طریقوں کے رواج کو روک سکیں، ان پر اسلامی احکام جاری کر سکیں، اور اپنی قوم میں جو اصلاحات ہم خود اپنے طریق پر نافذ کرنے کی ضرورت سمجھیں ان کو خود اپنی طاقت سے نافذ کر سکیں مثلاً زکوٰۃ کی تحصیل، اوقاف کی تنظیم، قضاء شرعی کا قیام، قوانین معاشرت کی اصلاح وغیرہ

(۲) ہم اس ملک کے نظم و نسق اور اس کی تمدنی و معاشی تعمیر جدید میں اپنا اثر اس طرح استعمال کر سکیں کہ وہ ہمارے اصول تمدن و تہذیب کے خلاف نہ ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ وسیع پیمانہ پر تمام ملک کی اجتماعی زندگی اور معاشی تنظیم اور تدبیر مملکت کی مشین جو شکل بھی اختیار کرے گی اس کا اثر دوسری قوموں کی طرح ہماری قوم پر بھی پڑے گا۔ اگر یہ تعمیر جدید اس نقشہ پر ہو جو اپنے اصول و فروع میں کلیۃً ہماری تہذیب کی ضد ہے تو ہماری زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایسی صورت میں ہمارے لیے ناگزیر ہو جائیگا کہ یا تو ہم تمدن و معیشت کے اعتبار سے غیر مسلم بن جائیں، یا پھر ہماری حیثیت اس ملک میں تمدنی و معاشی اچھوتوں کی سی ہو کر رہ جائے۔ اس نتیجہ کو صرف اسی طرح روکا جا سکتا ہے کہ ہند جدید کی تشکیل پر ہم اپنا اثر کافی قوت کے ساتھ ڈال سکیں۔

(۳) ہندوستان کی سیاسی پالیسی میں ہمارا اتنا اثر ہو کہ اس ملک کی طاقت کسی حال میں بیرون ہند کی مسلمان قوموں کے خلاف استعمال نہ کی جا سکے۔

یہ مقصد جس کی ہم نے توضیح کی ہے وہ کم سے کم چیز ہے جس کے لیے ہم کو لڑنا چاہیے۔ مدافعت کا پہلو صرف کمزور اختیار کرتے ہیں اور ان کا آخری انجام شکست ہے۔ اگر آپ اپنا مقصد صرف اُن حقوق کے حصول کو بناتے ہیں جن کا اطمینان کانگریس نے اپنے "بنیادی حقوق" والے ریزولیوشن میں دلایا ہے تو آپ دھوکے میں ہیں۔ آپ کی تہذیب، زبان، پرسنل لاء اور مذہبی حقوق کا تحفظ بھی (جسے آپ کافی سمجھے بیٹھے

ہیں) دراصل اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آپ فارورڈ پالیسی اختیار کرکے حکومت کی تشکیل میں طاقت ور حصہ دار بننے کی کوشش کریں۔ اس میں اگر آپ نے غفلت کی اور حکومت کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں تو یقین رکھیے کہ کوئی کانسٹی ٹیوشن آپ کو من حیث المسلم ہلاک ہونے سے نہ بچا سکے گا۔ انگریزی حکومت نے بھی آپ کے بہت سے حقوق تسلیم کر رکھے ہیں، مگر غور کیجیے وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کو خود اپنے حقوق سے دست بردار کرا دیا؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا، بولنا سب چھوڑ دو اور میری زبان اختیار کر لو؟ پھر کیا چیز ہے جس نے آپ کی قوم کے ہزاروں لاکھوں افراد کو اپنی زبان سے بیگانہ بنا دیا اور انگریزی کا آشنا غلام بنایا کہ وہ اپنے گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں تک سے انگریزی بولنے لگے؟ انگریز نے آپ سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نماز روزہ چھوڑ دو، زکوٰۃ نہ دو، شراب پیو، اور اپنے مذہب کے سارے احکام کو نہ صرف بالائے طاق رکھ دو بلکہ ان کا مذاق تک اڑاؤ۔ پھر کس چیز نے آپ کی قوم کے لاکھوں کروڑوں افراد کو ایک صدی کے اندر اپنے دین و ایمان سے عملاً منحرف کر ڈالا؟ انگریز نے آپ سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا تھا کہ اپنی معاشرت بدل دو، اپنا لباس بدل دو، اپنے مکانوں کے نقشے بدل دو، اپنے آداب و اخلاق بدل دو، اپنی صورتیں بگاڑو۔ اپنے بچوں کو انگریز بناؤ، اپنی عورتوں کو میم صاحب بناؤ، اپنے تمدن اور اپنی تہذیب کے سارے اصول چھوڑ کر پوری زندگی ہمارے نقشے پر ڈھال لو۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جس نے آپ سے یہ سب کچھ کرا ڈالا؟ ذرا دماغ پر زور ڈال کر سوچیے۔ کیا اس کا سبب غیر مسلم اقتدار کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ ڈھائی تین لاکھ انگریز چھ ہزار میل دور سے آتے ہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ قصداً آپ کے اندرونی معاملات اور آپ کے تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے پرہیز کرتے ہیں۔ پھر بھی ان کے اقتدار کا یہ اثر ہوتا ہے کہ بیرونی جبر سے نہیں بلکہ اندرونی انقلاب سے آپ کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے اور آپ خود بخود اپنے ان بنیادی اور فطری حقوق تک سے دست بردار ہو جاتے ہیں جن کو کوئی حکومت اپنی رعایا سے نہیں چھینتی اور نہیں چھین سکتی۔ اب ذرا اندازہ لگائیے کہ اگر آزاد ہندوستان کی حکومت غیر اسلامی نقشہ

پر بن گئی اور اس کا اقتدار ان ہندوستانیوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو مسلمان نہیں ہیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ وہ انگریزوں کی طرح قلیل التعداد بھی نہیں۔ آپ سے الگ تھلگ رہنے والے بھی نہیں۔ اور پھر غیر ملکی بھی نہیں ہیں کہ سیاسی پالیسی ان کو تمدنی و معاشرتی مسائل میں دخل دینے سے روکے۔ ان کے اقتدار میں آپ کے اندرونی تحول و انقلاب کا کیا حال ہوگا اور کانسٹی ٹیوشن کی کون کونسی دفعات آپ کو خود اپنے حقوق کی پامالی سے روکیں گی؟

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں کے لیے ایسی آزادی وطن کے لیے لڑنا تو قطعی حرام ہے جس کا نتیجہ انگلستانی غیر مسلموں سے ہندوستانی غیر مسلموں کی طرف اقتدار حکومت کا انتقال ہو۔ پھر ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ وہ اس انتقال کے عمل کو بیٹھے ہوئے خاموشی سے دیکھتے رہیں، اور ان کے لیے یہ بھی حرام ہے کہ اس انتقال کو روکنے کے لیے انگلستانی غیر مسلموں کا اقتدار قائم رکھنے میں معاون بن جائیں۔ اسلام ہم کو ان تینوں راستوں پر جانے سے روکتا ہے۔ اب اگر ہم مسلمان رہنا چاہتے ہیں اور ہندوستان میں اسلام کا وہ حشر دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں جو اسپین اور سسلی میں ہو چکا ہے تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم آزادی ہند کی تحریک کا رخ حکومت کفر کی طرف سے حکومتِ حق کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں اور اس غرض کے لیے ایک ایسی سرفروشانہ جنگ پر کمربستہ ہو جائیں جس کا انجام یا کامیابی ہو یا موت۔

یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

اوپر کی سطروں میں ہمارا نصب العین پوری طرح واضح ہو چکا ہے۔ ہم آزادی ہند کے مخالف نہیں ہیں، بلکہ ہر آزادی خواہ سے بڑھ کر اس کے خواہشمند ہیں اور اس کے لیے جنگ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں لیکن

وطن پرست کے نصب العین سے ہمارا نصب العین مختلف ہے۔ وہ صرف ایسی آزادی چاہتا ہے جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کی نجات ہو۔ اور ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جس کا نتیجہ "ہندوستانی" کے ساتھ "مسلم" کی نجات بھی ہو۔

نصب العین کی اس تعیین کے بعد ہمیں جس سوال پر اپنی تمام قوت فکر صرف کر دینی چاہیے وہ طریق جنگ کا سوال ہے۔ یہ سوال نظریات سے حل کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق عملی سیاست سے ہے۔ ہم کو اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے ایسی ہی تدبیریں سوچنی ہیں جن کے ذریعہ سے کامیابی کے حصول کی زیادہ سے زیادہ امید کی جا سکتی ہو۔ سب سے زیادہ پریشانی کا سبب یہ ہے کہ بہت قیمتی وقت ہم کھو چکے ہیں۔ اور بہت ہی کم وقت اب باقی ہے۔ جو خطرات آج ہمکو چونکا رہے ہیں وہ دراصل سنہ ۱۹ میں پوری طرح نمایاں ہو چکے تھے اور سنہ ۳۰ و سنہ ۳۱ میں تو ایک اندھا بھی ان کو دیکھ سکتا تھا۔ جو کچھ آج ہم سوچ رہے ہیں اس کو سوچنے اور عمل شروع کر دینے کا اصلی وقت وہ تھا۔ مگر افسوس کہ ہمارے سردار محض فضول حرکات میں اپنا وقت گنواتے رہے، اور انہوں نے اپنی قوم کو سنبھالنے کے لیے کچھ بھی نہ کیا۔ اب کہ طوفان ہمارے سر پر آ چکا ہے، ہم بہت سی اُن تدبیروں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہیں جو کارگر ہیں مگر دیر طلب ہیں۔ یہیں اب وہ طریقے اختیار کرنے چاہییں جو تھوڑے وقت میں کوئی مفید نتیجہ پیدا کر سکیں۔

مقالات

شخصیت پرستی

(۴)

ازجناب چوہدری غلام احمد صاحب (پرویز)

۴۔ پیر پرستی: عبادات میں اخلاص کا ہونا ضروری ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں احسان کہتے ہیں اگر اخلاص نہ ہو تو پھر عبادت یا تو محض ریاکاری ہو جاتی ہے یا مشینی عمل کہ جس میں حرکت تو ہوتی ہے لیکن روح مفقود۔ جب عوام میں کچھ ظاہرداری آنے لگی تو حقیقت بین نگاہوں نے اخلاص پر زور دیا اور عبادات کے اصل مقصد یعنی تزکیۂ نفس اور صفائی قلب کی طرف توجہ دلائی۔ یہ تھی تصوف کی ابتدا۔ لیکن جس طرح اور شعبوں میں غلو و تشدد ہوا اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر، اس شعبہ میں ہوا۔ رفتہ رفتہ ایک نیا دین قائم ہو گیا جس کا تعلق باطن سے قرار دیا گیا، اور جو دین متواتر چلا آتا تھا اُسے شریعت ظاہری کا لقب دیدیا گیا۔ آہستہ آہستہ اس ظاہری شریعت کے بے روح اور باطنی طریقت کے حقیقتِ دین قرار دیئے جانے سے اول الذکر ایک بے معنی فرسودہ اور بیکار سا عمل تصور ہونے لگا اور اصل شریعت یہی باطن پرستی ہو گئی۔ گویا "مغزِ قرآن" تھا جسے اہلِ معرفت نے اپنے لیے مخصوص کر لیا اور "اُستخواں کا ڈھیر پیشِ سگاں" پھینکدیا۔ ظاہر ہے کہ جب شریعت ظاہری کو اس درجہ مہمل اور گھناؤنا بنادیا جائے تو اس پر عمل بھی کیسے رہ سکتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ہوا یہ کہ وہ تمام عبادات و مناسک جن کے ذریعہ سے صدرِ اول کے مسلمانوں نے (رضی اللہ عنہم) دین و دنیا کی برکات حاصل کر لی تھیں اساطیر الاولین ہو گئیں اور ان کی جگہ ایسے اعمال و وظائف نے لے لی جو یا تو ایران کے آتشکدوں سے آئے تھے یا یونان کے اشراقیین کے زوایا سے۔ اس سے آگے بڑھے تو ہندوستان کی ویدانت نے اس کے ماتھے پر سیندور کا قشقہ لگایا۔

بغداد کی تباہی اونگھنے کے لیے تھپکنے کا بہانہ بن گئی۔ مرکز کی بربادی، ملت کا انتشار، نہ سینوں میں وہ دل۔ نہ دلوں میں وہ حوصلے۔ مجاہدانہ ولولے، سپاہیانہ امنگیں، چلہ کشی اور زاویہ نشینی میں بدل گئیں۔ اب نہ وہ عقائد تھے نہ اعمال۔ زندہ خدا کا زندہ مذہب جس نے سوئی ہوئی دنیا کو جگا دیا تھا، اب دنیا کو سلانے کے کام آنے لگا چونکہ یہ تمام علوم سینہ بسینہ منتقل ہوتے چلے آرہے تھے، اس لیے خدا، رسول، قرآن، شریعت، سب سمٹ سمٹا کر ایک انسان میں جمع ہو گئے جسے مرشد طریقت کہا گیا۔ انسان پرستی نسل پرستی کی طرف منجر ہوئی۔ اور "ارضی خلافت" کی طرح اس "روحانی خلافت" کا سلسلہ بھی وراثتاً منتقل ہونے لگا۔ اب اس میں اور برہمیت میں کچھ زیادہ فرق نہ رہا۔ پیر کا حکم با سند خدا کا حکم ہے۔ اس کے کسی لفظ اور عمل پر تنقید نہیں ہو سکتی۔ لب کشائی تو ایک طرف دل میں بھی اس کے خلاف گرانی محسوس نہیں ہونی چاہیے۔ کہ پیر دل کی لغزشوں اور آنکھ کی خیانتوں سے حاضر و غائب اسی طرح واقف ہے جس طرح خدا۔ خدا کی ناراضی تو پھر بھی گوارا کی جا سکتی ہے لیکن پیر کی ناراضی بڑی سخت چیز ہے کیونکہ اس سے تو انسان دنیا و عقبیٰ دونوں میں راندۂ درگاہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کہیں ٹھکانا ہی نہیں۔ پھر نہ خدا اس کی مدد کر سکتا ہے نہ کوئی انسان حتیٰ کہ اگر کسی وقت خدا اور پیر میں سے ایک کو چھوڑنے اور دوسرے کو رکھنے کی مجبوری لاحق ہو جائے تو فیصلہ یہ ہو کہ "ہر تیاگوں گر نا تیاگوں"*۔ اللہ اکبر! اسلام انسانی استبداد مٹانے آیا تھا۔ ملوکیت کا استبداد تو انسان کے جسم تک ہی محدود تھا لیکن اس استبداد کو دیکھیے کہ دل و دماغ پر مستولی ہے۔ رگ و ریشہ تک میں اترا ہوا ہے قلب و روح پر چھایا ہوا ہے۔ اگر پیر کی عظمت کے خلاف دل میں بھی کوئی خیال گذر جاتا ہے تو یہ ڈرتا ہے لرزتا ہے، کانپتا ہے۔ حالانکہ مومن کی شان یہ تھی کہ اسے خدا کے سوا دونوں عالم میں کسی کا ڈر نہیں ہو سکتا تھا۔ خوف کا نشیمن تو مشرک کا قلب ہے جو عاجز و درماندہ مخلوق کے سامنے جھکتا ہے۔

* خدا کو چھوڑ سکتا ہوں لیکن پیر کو نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ ایک مشہور صوفیانہ ہندی دوہے کا آخری مصرع ہے۔

سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ (۳:۱۵۱)

ہم کفار کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے اس وجہ سے کہ وہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں۔

اور ان انسانوں سے ڈرتا ہے جو خود اس جیسے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ (۷:۱۹۴)

یقیناً جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ خود تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔

کہتے ہیں کہ صاحب ہم مرشد کو سجدہ تو نہیں کرتے۔ پھر یہ شرک کیسے ہوا لیکن انہیں معلوم نہیں کہ شرک ایک سجدہ تک ہی محدود نہیں۔ غیر کو سجدہ تو شرک کی ایک محسوس شکل ہے۔ اس کے علاوہ بڑی بڑی صورتیں ایسی بھی ہیں جو غیر مرئی اور غیر محسوس ہیں۔ وہاں تو شرک کی وسعت اس حد تک ہے کہ

أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ ۔ (۲۵:۴۳)

کیا تم نے اس کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات کو ہی اپنا خدا بنا لیا۔

فرمائیے! اتباع خواہشات میں کس کو سجدہ کیا جاتا ہے؟ اس میں شرک یہی ہے کہ اتباع جو صرف خدا کے فرمان کا ہونا چاہیے تھا، غیر خدا کی طرف منتقل ہو گیا۔ غیر خدا چاہے وہ انسان کا اپنا نفس ہی کیوں نہ ہو، جب مالک و مطاع بنا لیا جائے، اور خدا کے فرامین سے بے نیاز ہو کر اس کی پیروی کی جائے تو یقیناً شرک ہے۔ اب دیکھیے کیا پیر کی اطاعت اس طرح نہیں کی جاتی کہ جو کچھ وہ حکم دے۔ بلا سند کتاب وسنت، واجب الاتباع سمجھ لیا جائے؟ کہتے ہیں کہ ہم پیر کی اطاعت اس لیے کرتے ہیں کہ۔ ع۔

سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

لیکن کیا یہود و نصاریٰ جس بنا پر اپنے احبار و رہبان کی اطاعت کرتے تھے وہ اس سے کچھ مختلف تھی؟ پھر خدا نے قرآن میں اس کو شرک کیوں قرار دیا؟ کہتے ہیں کہ ہم اطاعت مرشد تقرب الٰہی کے لیے کرتے ہیں۔ لیکن دیکھیے کہ مشرک کس غرض سے غیر اللہ کی بندگی کرتے تھے:۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِہٖٓ اَوْلِیَآءَ — اور جو لوگ خدا کے سوا دوسروں کو کارساز بناتے ہیں
مَا نَعْبُدُھُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی — وہ (کہتے ہیں کہ) ہم تو ان کی پرستش اس لیے کرتے ہیں کہ
(۳ : ۳۹) — کہ وہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

کہتے ہیں کہ ہم پیر کو وسیلہ بناتے ہیں معرفت الٰہی کے لیے۔ اس کی سند میں یہ آیت پیش کی جاتی ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْٓا — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف
اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (۳۵ : ۵) — وسیلہ ڈھونڈھو۔

حالانکہ یہی آیت ان کے اس دعوے کی تردید کر رہی ہے۔ اوپر کا حصۂ آیت کا آدھا ٹکڑا ہے باقی حصہ اس وسیلہ کی تشریح کر رہا ہے کہ

وَجَاھِدُوْا فِیْ سَبِیْلِہٖ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ — اور اس کے راستہ میں جہاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ

یعنے تقرب الٰہی کا حقیقی وسیلہ جس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ ہے کہ راہ حق میں باطل کے خلاف جانفشانی اور سخت جدوجہد کی جائے۔ یہ وسیلہ وہی چیز ہے جسے غالب نے "تقریب بہر ملاقات" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی انسان کا دامن تھام لو اور علم وعمل سے بے پروا ہو کر یہ سمجھ بیٹھو کہ جس کا دامن تھاما ہے، وہی خدا سے لے جا کر ملا دے گا۔ ایسے اندھے توسل کی تو اسلام نے ہرگز تعلیم نہیں دی۔ آنکھیں بند کر کے کسی انسان کی پیروی کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اگر پیشوا گمراہ ہو تو وہ پیروؤں کے ریوڑ کو جس گڑھے میں چاہے لے جا کر پھینک دے۔ توسل کے اسی غلط تصور نے یہاں تک نوبت پہونچا دی کہ سندھ کے ایک پیر صاحب نے اپنے گھر کو کعبہ قرار دیا اور ان کے مرید اس کعبہ کا حج کرنے لگے۔

اصل یہ ہے کہ ایک غلط طریقہ کو جائز و برحق ثابت کرنے کے لیے نہایت معصوم صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور قرآن وحدیث کی آیتیں اس غرض کے لیے توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی ہیں کہ اس

طریقہ کی چند ظاہری صورتوں کو مشروع ثابت کر دیا جائے۔ حالانکہ اگر اس کی روح کو دیکھا جائے تو وہ قطعاً منافی اسلام ہے۔ پیر کے اندر وہ تمام صفات جمع کر دی جاتی ہیں جو صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں۔ اُس سے ڈرتے ہیں اس لیے کہ اس کی ناراضگی سے نقصان و ضرر پہونچتا ہے۔ اسے مناتے ہیں اس لیے کہ اس کی خوشنودی سے منافع و مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔ حالانکہ نفع و نقصان کا واحد مالک آقائے حقیقی ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا (۴۸:۱۱) کہیے کہ اگر تمہیں اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو وہ کون ہے جو اس کے سامنے تمہارے لیے کسی بات کا بھی اختیار رکھتا ہو۔

چونکہ پیر کے متعلق یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اسے محکمۂ قضا و قدر میں دخل حاصل ہوتا ہے اس لیے اس سے دعائیں کرائی جاتی ہیں۔ بلاشبہ ایک مومن کا دوسرے مومن کے لیے دعائیں کرنا نیک عمل ہے اور جس قدر کوئی خلوص دل سے دعا کریگا اسی قدر اس کی اجابت کی زیادہ امید ہوگی۔
لیکن اس نیت سے دعائیں کرانا کہ خدا ہماری تو سنتا نہیں ان کی وہاں تک رسائی ہے اس لیے اُس سے بات منوالیں گے، یقیناً خدا کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ اللہ تو ہر بندۂ مومن سے فرماتا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔ اور اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ۔ کون ہے جو کسی بے قرار کی فریاد رسی کرتا ہے؟ ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ کیا وہ اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی ہے؟ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ۔ اور جب میرے بندے میری بابت تم سے پوچھیں تو کہدو کہ میں (ان سے) قریب ہی ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جب کہ وہ مجھے پکارے۔
یاد رکھیے کہ ہدایت قرآن میں آچکی۔ ظاہر۔ باطن۔ شریعت طریقت سب کچھ وہی ہے۔ خدا کے

ملنے کا راستہ بھی وہی ہے جسے خدا ہی نے صراط مستقیم کہا۔ اور جسے خود نبی اکرمؐ نے امت کو دکھا دیا اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کوئی چور دروازہ نہیں جس کے راستے کوئی دوسرا خدا تک لے جائے اور یہ راستہ صرف اسی طرح ملتا ہے کہ تمام انسانوں کی غلامی کا طوق اتار کر صرف ایک خدا کی غلامی اختیار کر لی جائے۔ یہی خود رسول اللہ نے کیا۔ اور اسی کے کرنے کا حکم دیا۔

اِنَّ اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ فَاعْبُدُوْہُ ۔ ھٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۔ (۳:۵۰) میرا اور تمہارا رب وہی اللہ ہے ۔ اسی کی غلامی اختیار کرو۔ یہ ہے صراط مستقیم۔

اس کے علاوہ اور کوئی "راز" نہیں جو حضور خفیہ خفیہ کسی ایک کو بتا گئے ہوں۔ کہ یہ چیز تبلیغ رسالت کے منافی تھی جس کے لیے حضور مامور تھے۔

باقی رہی بزرگوں کی تعظیم تو اس میں بلاشبہ بڑی سعادت ہے۔ ان کی مبارک زندگیاں ہمارے لیے تقویت ایمان کا موجب ہیں اس لیے کہ انہوں نے دنیا کو بتا دیا کہ کس طرح اپنے نفس کے شیطانی رجحانات کو تقویٰ و خشیت الٰہی کی قوتوں سے مغلوب کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح ایک اللہ کا ہو کر سارے جہان کی غلامی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے تمام دنیا کی مخالفت کے باوجود بڑے بڑے کفر و الحاد کے مرکزوں میں جا کر قرآن و اسوہ حسنہ کی روشنی راہ گم کردہ انسانوں تک پہونچائی۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اعمال صالحہ آج اس الحاد و مادہ پرستی کے بحر تلاطم میں روشنی کے میناروں کی طرح محکم و استوار کھڑے ہیں کہ حوادث زمانہ کی نا مساعد موجیں آئیں اور ان سے سر ٹکرا کر لوٹ جائیں۔ وَكَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۔

لیکن تعظیم اور تعبد کے باریک فرق کو بھول جانے سے صحیح راستہ گم ہو جاتا ہے۔ لہذا اسے کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔

۵۔ **مردہ پرستی** | پیر پرستی کی غلامی کا طوق پیر کی زندگی تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ اس کی مملکت

ابدی ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی طرح قلب و دماغ پر چھایا رہتا ہے جیسا زندگی میں۔ بلکہ اب اس کی گرفت پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو جاتی ہے کہ اب وہ دربار خداوندی کا حاضر باش ممبر تصور کیا جاتا ہے۔ بلکہ عقیدہ "وصول بالحق" کی رو سے تو وہ خدا میں مل کر خود خدا بن جاتا ہے۔ وہ تمام مریدوں کے حالات سے باخبر ہوتا ہے۔ ہر ایک کی دعائیں سنتا ہے۔ ان کی مشکل کشائی کرتا ہے مصیبت میں بعض اوقات بنفس نفیس تشریف لا کر حاجت روائی کرتا ہے۔ غرضیکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کو کرنا چاہیے تھا اب اس کی جگہ پیر صاحب کرتے ہیں۔ حالانکہ مُردوں کے متعلق قرآن کریم کا کھلا کھلا فیصلہ ہے کہ یوم بعث تک وہ کسی دنیا والے کی سننے اور جواب دینے پر قادر نہیں ہیں۔

اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۱۴:۳۵)

اور اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور اگر سنیں بھی تو جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے دن وہ تمہارے شرک سے انکار کر دیں گے

ان کو اتنا بھی علم نہیں کہ وہ کب قیامت کے لیے اٹھائے جائیں گے۔

"اور جن کو وہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ خود مخلوق ہیں۔ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں، اور اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے (۱۶:۲۱)

۶۔ ماضی پرستی | ہم نے جس قدر پرستشیں گنائی ہیں اگر آپ بنظر تعمق دیکھیں گے تو ان میں ایک چیز بطور قدر مشترک نظر آئے گی، اور وہ ماضی پرستی ہے۔ یہی ان تمام غلط عقائد کی اصل ہے۔ اسلام مستقبل کو درخشندہ و تابناک دکھلانے والا مذہب تھا۔ لیکن انسانی دماغوں نے جس مذہب کی تشکیل کی وہ تو بہر کیف انسانی مذہب ہی ہو سکتا تھا جس کی رو سے ہمیشہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آج بڑا تاریک ہے۔ اور گذشتہ کل بڑا روشن تھا یعنی کلجگ ہے اور وہ ست جگ تھا۔ آپ آج سے پیچھے ہٹتے جائیے اور ہر ایک ایسے بزرگ کی تصنیف اٹھائیے جس کا عہد آپ کے نزدیک بڑا مقدس اور نورانی تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ

وہ بھی یہی گلہ کرتے ہوں گے کہ ہمارا زمانہ بڑا تاریک ہے۔ اور گذشتہ زمانہ بڑا تابندہ تھا۔ ذہن انسانی کی کچھ افتاد ہی ایسی ہے۔ اور اسی افتاد کا نتیجہ ہے کہ جو شئے گذشتہ زمانہ سے متعلق ہو وہ واجب التعظیم ہوجاتی ہے۔ ائمہ پرستی۔ اسلاف پرستی۔ مردہ پرستی۔ سب اسی ماضی پرستی کی مختلف شاخیں ہیں۔ اور جب تک ماضی پرستی کا تخیل درست نہ ہوگا حقائق پرستی کبھی نہیں آئے گی۔ ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم ماضی سے بے نیاز ہوجائیں۔ ماضی ہمارے آباء کی وراثت ہے ہم اس سے متمتع کیوں نہ ہوں لیکن ماضی کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ہر ایک فن عہد ماضی میں اپنی تکمیل کو پہنچ گیا اور ایسا مکمل ہوگیا کہ اس میں کوئی نقص، کوئی کمی باقی نہیں رہی۔ نہ اس پر اضافہ ہوسکتا ہے نہ ترمیم۔ نہ اس پر تنقید ہوسکتی ہے نہ تنقیح۔ یہ ہے ماضی پرستی۔ دین یقیناً مکمل ہوچکا۔ اور اس اعتبار سے عہد رسالت مآب اور عہد صحابہ کبار نوع انسانی کی تاریخ میں اسلام کا مکمل ترین عہد ہے کہ اس وقت قرآن ہدایت تھا اور اسوہ حسنہ اس کے لیے روشنی تھی اور دین میں ابھی ذہن انسانی کی کارفرمائیاں نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن حقائق قرآنی تو کسی زمانہ کے ساتھ وابستہ نہیں ہیں۔ قرآن تو کتاب فطرت ہے۔ اور جس طرح فطرت کے رازہائے سربستہ ذہن انسانی کی نشو و ارتقاء کے ساتھ بے نقاب ہوتے چلے جارہے ہیں، اور فطرت کی کوئی شئے کسی مقام پر بھی جاکر یہ نہیں کہہ دیتی کہ بس اب مجھ میں مزید تحقیق بیکار ہے۔ میرے سینے میں جس قدر گہرہائے آبدار موجود تھے وہ سب باہر آچکے ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم کے حقائق بھی عقل انسانی کے ساتھ ساتھ جلوہ بار ہوتے جائیں گے، اور چونکہ یہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے آخری کتاب ہے اس لیے جب تک دنیا میں انسان باقی ہیں یہ ان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے مطابق سامان ہدایت دیتی چلی جائے گی۔ اسی اعتبار سے ہم کہتے ہیں کہ قرآن کسی خاص ماحول میں مقید نہیں ہوسکتا لیکن ماضی پرستی ہمیں ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ اور یہی ہے وہ چیز جس سے دماغ پر سخت بیڑیاں پڑجاتی ہیں، عقلیں معطل ہوجاتی ہیں۔ قوائے عمل مضمحل ہوجاتے ہیں۔ فکر و نظر کی قوتیں سلب ہوجاتی ہیں۔

کبھی قدم اٹھتے بھی ہیں تو منہ کا رخ چونکہ پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ اس لیے ہر قدم پر منزل سے اور بُعد ہوجاتا ہے۔ قومیں آگے بڑھتی ہیں! اور یہ قوموں کے امام پیچھے جاتے ہیں۔ دنیا اوپر کو ابھرتی ہے اور یہ دنیا کے پیشوا نیچے کو جاتے ہیں ۔ ان کے پاؤں میں اتنی بوجھل زنجیریں ہیں کہ وہ انہیں اوپر اٹھنے ہی نہیں دیتیں۔ جن قوموں میں دین رسوم پرستی بن کے رہ گیا (اور یہ ماضی پرستی کا ہی دوسرا نام ہے) وہ قومیں کبھی ابھر نہیں سکیں۔ انہوں نے کبھی ابھرنا بھی چاہا تو چونکہ ان کا اصل دین ان سے گم ہوچکا تھا اس لیے انہیں سہارا دینے کی کوئی چیز نہ مل سکی لیکن افسوس ہے مسلمانوں پر کہ ان کے پاس خدا کی کتاب زندہ۔ اس کے رسولؐ کا اسوۂ مقدسہ زندہ۔ اور یہ قوم پھر بھی مُردہ کی مُردہ سچ ہے زمین شور پر ابر رحمت کیا گہرباری کریگا۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ

حقائق پرستی | آپ نے غور فرمایا کہ یہ تمام پرستشیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس لیے پیدا ہوگئیں کہ مسلمانوں نے بھی دیگر مذاہب کے متبعین کی طرح، حقائق پرستی کو چھوڑ کر، شخصیت پرستی اختیار کرلی۔ حالانکہ ان کے پاس حقائق ازلی کا مکمل دستور اپنی اصلی صورت میں موجود تھا اور انہیں اس کو چھوڑ کر کسی ظن وتخمین کے اتباع کی ضرورت ہی نہ تھی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ علوم وفنون کی نشرواشاعت زیادہ تر عہد عباسیہ میں ہوئی لیکن اس زمانہ میں مرکز اسلام پر یکسر عجمیت غالب آچکی تھی۔ اور شاہ پرستی عجمیوں کی فطرت میں داخل تھی۔ اس لیے اگر ایکطرف بادشاہ ظل اللہ قرار دیا گیا۔ تو دوسری طرف ائمۂ دین وعلوم کی پرستش بھی کسی کم درجہ میں نہیں کرائی گئی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ تنقید کی حد سے بالاتر وہ چیزیں ہوسکتی ہیں جن پر ایمان لانے کے لیے ہم مکلف ہیں نہ کہ ہر انسان۔ خدا۔ رسولؐ کتاب۔ ملائکہ آخرت۔ اجزائے ایمان ہیں اور اس لیے تنقید سے بلند۔ لیکن کسی اور انسان پر ایمان لانا تو کہیں نہیں لکھا۔ اس لیے ان کو تنقید سے بالا کیوں سمجھا جائے؟ اس میں شبہ نہیں کہ جس قسم کی غلط عقیدت وارادت

ہمارے دلوں میں بزرگان سلف رح کی طرف سے پیدا ہو چکی ہے اور جو صدیوں سے متوارث چلی آتی ہے اس کو کسی اور قسم کی عقیدت اور ارادت سے بدل دینا آسان نہیں۔ ذہنی غلامی کے جو طوق و سلاسل مسلمانوں نے اپنی گردنوں میں ڈال رکھے ہیں اور جن کے وہ اب اس درجہ خوگر ہو چکے ہیں کہ وہ گویا فطرت ثانیہ بن چکے ہیں ان کا اتار پھینکنا اب تقریباً محال معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی تیتر یا بٹیر کو ایک عرصہ تک پنجرہ میں بند رکھا جائے تو وہ پھر اس قفس کا اس درجہ عادی ہو جاتا ہے کہ اس کا مالک اسے پنجرہ کے باہر کھلا چھوڑ دیتا ہے خود پنجرہ سے کر آگے آگے چلتا ہے۔ اور وہ اس کے پیچھے دوڑتا ہے اور چونچیں مار مار کر اس کا بند دروازہ کھولتا ہے۔ حالانکہ اس کے بازو دل میں قوت بھی ہوتی ہے۔ اور آزادی کی فضائے بسیط اُس کی آنکھوں کے سامنے لیکن اس کے نزدیک جو آرام قفس کے گوشہ میں ہوتا ہے کھلی فضا میں نہیں ہوتا کیونکہ وہ کھلی فضا کو غیر فطری چیز سمجھنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح مدتہائے دراز کی ذہنی قید کی وجہ سے ہم اس درجہ خوگر بند و سلاسل ہو چکے ہیں کہ ان کے اتار پھینکنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ایک متاع گراں بہا چھنی جا رہی ہے۔ دین ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔ عاقبت خراب ہو رہی ہے لیکن یہ سب ہمارے قلوب کے وساوس ہیں۔ ذہن کے چھلاوے ہیں۔ جس چیز کو ہم حقیقت سمجھ رہے ہیں وہ حقیقت نہیں۔ جو ہمیں ہدایت نظر آتی ہے وہ ہدایت نہیں۔ دھوکہ ہے۔ فریب ہے۔ اور یہ اس لیے کہ

وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ ۔ وَإِنَّهُمْ لَيَصُدُّونَهُمْ عَنِ السَّبِيلِ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ۔ (۴۳ : ۳۶-۳۷)	جو شخص خدا کے ذکر (قرآن) سے اندھا بن جاتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ رہتا ہے وہ (شیاطین) ان کو راہ سے گمراہ کر دیتے ہیں (روکتے رہتے ہیں) اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سیدھے راستے پر ہیں

آخر میں میں حضرات علمائے کرام کی خدمت میں بادب درخواست کروں گا کہ وہ تصریحات بالا پر ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں، اور دیکھیں کہ قرآن کریم کی تعلیم ہمیں کدھر بلا رہی ہے اور ہم کدھر جا رہے ہیں۔ ان حضرات کو شکایت ہے کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ، دین سے بیگانہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے لیکن ان حضرات نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔ چونکہ یہ حضرات عملی دنیا سے بالعموم الگ رہتے ہیں اس لیے انہیں معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ الحاد و بیدینی کی اس رو کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ دین کی اتنی ہی خدمت اور ان برائیوں کا صرف اسی قدر علاج کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے مواعظ و فتاویٰ میں ان لوگوں کو مردود و ملعون قرار دیدیا جائے۔ لیکن اس سے تو اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اس سے مرض اور بڑھ جاتا ہے۔ مجھے نوجوانوں کی ایسی جماعت سے خلا ملا کا بہت موقع ملتا ہے۔ درحقیقت میری زندگی ہی ان میں گذر رہی ہے۔ اس لیے مجھے ان کی ذہنی افتاد اور رجحانات قلبی کے مطالعہ کا خوب موقع ملتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان میں سے بہتوں کے ساتھ یہ ہوا کہ ان کی فطرت صحیحہ نے مذہبیات کے اُس حصہ سے بغاوت کرنی چاہی جو انسانوں کا وضع کردہ ہے۔ لیکن ان پر جبر کیا گیا کہ وہ اُسے بھی دین خداوندی ہی سمجھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اُس حصہ سے بھی بغاوت کرنے لگے جو فی الواقع خدا کی طرف سے تھا۔ چنانچہ مجھے کئی ایک ایسے نوجوانوں سے سابقہ پڑا جو اسی طرح حامیان دین کے بگاڑے ہوئے مریض تھے۔ میں نے ان کے سامنے آہستہ آہستہ وہ دین پیش کیا جو فی الحقیقت دینِ حق ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ وہ حقیقت کے گرویدہ ہو گئے۔ چنانچہ ان میں سے اب اکثر ایسے ہیں جو اپنی بیشتر مساعی خود دین کی مدافعت میں مصروف کرتے ہیں۔ میں نے ایسا کرنے میں قطعاً یہ نہیں کیا کہ جدت پسند طبقہ کی طرح قرآن کریم کی دور از کار تاویلات کی ہوں۔ اور ان کے ذہنی و قلبی رجحانات کی رعایت کر کے حقیقت کو ان سے چھپایا ہو۔ یا دین کو محض ایک آئیڈیل کی حیثیت سے پیش کر کے عبادات و شعائرِ الٰہی کو

بے معنی قرار دیا ہو۔ نَعُوذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ بلکہ کیا صرف یہ کہ قرآن کریم کی تفسیر خود قرآن سے اور اس کی عملی مثال اسوۂ رسول اللہ سے ان کے سامنے رکھدی۔ اور اس کے بعد بتادیا کہ کوئی نظریہ یا قول خواہ زمانۂ جدید سے متعلق ہو یا قدیم سے، جو اس کسوٹی پر پورا نہ اترے وہ کبھی حقیقت ثابتہ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت صرف یہی ہے اور یہی دین ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج بڑے اطمینان بخش ظاہر ہوئے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے اور ایک ایسے احول کا تجربہ ہے جسے "یکسر" یورپ زدہ" ماحول کہنا چاہیے اور جس کے ہاتھوں مولوی صاحبان اس درجہ نالاں ہیں۔ اور یہی تجربہ ہے جو ان سطور کے لکھنے کا محرک ہوا۔ یہ وہ بصیرت ہے جو مجھے قرآن سے حاصل ہوئی ہے۔ اور اگر میں اپنے فہم قرآن میں غلطی کرتا ہوں تو میں اس کی اصلاح کے لیے بھی ہر وقت تیار ہوں بشرطیکہ وہ غلطی قرآن ہی سے ثابت کی جائے (د)۔ ان الھدیٰ ھدی اللّٰہِ وفیہا بصائر للناس و ھدًی ورحمۃ لقوم یوقنون۔

التعلیق الصبیح علی مشکوٰۃ المصابیح

تالیف جناب مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

مشکوٰۃ شریف علم حدیث کی مشہور مستند کتابوں میں سے ہے جس میں صحاح ستہ اور دوسری معتبر کتب حدیث کا عطر نکال کر رکھدیا گیا ہے۔ فاضل مولف نے عربی زبان میں اس کی شرح لکھی ہے جسکے متعلق مولانا انور شاہ صاحب مرحوم و مغفور جیسے علامۂ اجل کی شہادت ہے کہ اب تک اس کتاب کی اس سے بہتر شرح نہیں لکھی گئی۔ اس میں پچھلی تمام شرحوں کی خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں اور ان پر حسب ذیل خصوصیات کا اضافہ کیا گیا ہے۔

۱۔ اسرار شریعت اور حقائق و معارف اسلامیہ کے بیان کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔

۲۔ ہر باب کے ابتدا میں اس کے مضمون کے لحاظ سے تمام آیات قرآنیہ جمع کر دی گئی ہیں تاکہ حدیث اور قرآن کے درمیان تطابق واضح ہو جائے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے مذہب مفصل بیان کیے گئے ہیں اور اختلافی مسائل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

یہ کتاب فاضل مولف نے خود دمشق جا کر چھپوائی ہے۔ کاغذ اور طباعت بہترین ہے۔ چار جلدیں طبع ہو چکی ہیں دو جلدیں عنقریب چھپ کر آنے والی ہیں۔

قیمت [illegible] کلدار۔ [illegible] حالی علاوہ محصول ڈاک دفتر ترجمان القرآن سے طلب فرمائیے۔

مقاصد قرآن

از مولانا سید صبغۃ اللہ حسینی بختیاری فاضل دیوبند استاذ جامعہ دارالسلام عمرآباد

قرآن مجید کے نازل ہونے کا اہم مقصد یہ ہے کہ انسانوں کی دینی و دنیوی زندگی کی پوری اصلاح کی جائے اور ان کی افراد و اقوام کو بھلائی کے ایسے طریقے تبلائے جائیں جن سے صحیح انسانی برادری پیدا ہو۔ اور انسانی عقلیں اپنے کمال کے مرتبوں پر فائز ہو کر نفس و روح میں صفائی اور اخلاقی پاکیزگی پیدا کریں۔

اس جلیل القدر مقصد کے حاصل کرنے کے لیے جو اصول مقرر کیے گئے ہیں ان میں مختلف پہلوؤں سے کام لیا گیا ہے جو نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت ضروری ہیں اسی لیے بعض اُن امور کو جو زیادہ اہم نہ تھے صرف ایک دفعہ بیان کر دینا کافی سمجھا۔ اور جو اپنی اہمیت اور افادیت کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور قوی تھے ان کو ذہن نشین کرانے کے لیے بار بار بیان کر کے تنبہ کیا گیا ہے کہ انسانی دنیا کو اس کی سخت ضرورت تھی تاکہ دلوں سے وہ تمام بے کار باتیں، سارے مزعومہ خیالات اور خرافات نکل جائیں جو آباؤ اجداد سے دماغوں میں راسخ چلے آرہے ہیں اور وہ تمام بڑی عادتیں اور خراب خصلتیں جن کی آلودگیوں سے انسانی روح کو کوفت ہو رہی تھی ان سب کو نکال کر ان کی بجائے ایسی اچھی باتوں اور عمدہ علوم و معارف کا تیج انسانی دلوں میں بو دیا جائے جس کے برگ و بار سے خود وہ بھی لطف اندوز ہوں اور دوسروں کو بھی اس سے حلاوت حاصل ہو سکے۔ بعض مقاصد ایسے بھی تھے جن کا نفع فوری حاصل ہونے والا نہ تھا بلکہ آیندہ چل کر ان سے فائدہ پانے کی امید ہو سکتی تھی اور چند چیزیں ایسی

بھی تھیں جو ایک ہی وقت میں کسی طرح پوری نہیں ہو سکتی تھیں بلکہ تدریجی رفتار سے اپنے درجۂ کمال پر پہنچنے والی تھیں اور پھر ان میں جو صراحت کے قابل نہ تھیں ان کی طرف صرف اشارہ کر دینا کافی تھا اسی لیے تفصیل کو چھوڑ کر اجمال سے کام لیا گیا۔ بہرحال قرآن نے اپنی پیش کردہ ہدایات میں ان طریقوں کو ملحوظ رکھا ہے کیونکہ یہی ایک ایسی آسمانی کتاب ہے جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی ذمہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک ایک حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے جو عجیب و غریب طریقہ اختیار کیا گیا اس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے اغراض میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (سورہ جمعہ رکوع)

وہی (خدائے قدوس) ہے جس نے امی لوگوں میں انہیں میں کا ایک رسول مبعوث فرمایا (جو) ان کو اس (خدائے قدوس) کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک و صاف کر دیتا ہے اور ان کو کتاب (الٰہی) اور حکمت و عقلمندی سکھاتا ہے اور وہ (لوگ) اس سے پیشتر صریح گمراہی میں پڑے تھے

ہم یہاں قرآن مجید کے وہ اصول بیان کرنا چاہتے ہیں جن کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے واسطے قیامت تک کے لیے لائے ہیں۔ آپ کے تشریف لانے سے پہلے خدا کی طرف سے جتنی کتابیں نازل کی گئیں اور جتنے انبیا مبعوث ہوئے ان سب کی تعلیمات کا خالص نچوڑ اور ان کے احکام کی حکمتوں اور مصلحتوں کا پورا خلاصہ ان اصول میں آگیا ہے اور جو خدا کی آخری کتاب ان اصول و کلیات کی حامل ہے اس کو انسانی دست برد سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا گیا۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (سورہ حجر ۱)

بیشک ہم ہی نے قرآن نازل کیا ہے اور بے شک ہم ہی

اس کی حفاظت و نگہبانی کرنے والے ہیں۔

اور اس کی حفاظت و صیانت کا بھی معقول کافی طور پر بندوبست کر دیا گیا ہے۔

لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ (حٰم سجدہ رکوع ۵) — اس میں باطل نہ دخل پائے گا نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے یہ قرآن حکیم حمید کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔

غرض ہر طرح سے اس کی ذمہ داری کا وعدہ فرمایا گیا، اور درحقیقت یہی کتاب برحق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر روشن دلیل ہے کہ وہ آپ پر خدائے تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہے نہ یہ کہ اس کو خود آپ ہی تصنیف کر رہے ہیں کیونکہ جو شخص بچپن ہی سے باپ کے سایہ سے محروم ہو چکا ہو اور ایک ایسی قوم کے ماحول میں پیدا ہوا ہو جو وحشت، جہالت، بربریت، قتل غارت گری اور لوٹ مار میں اپنی آپ نظیر ہو اور وہ بھی ایک ایسے شہر میں جہاں خدائی تعلیم کا کوئی چرچا نہ رہا ہو۔ پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ وہ شخص دنیا کے سامنے خود اپنی قابلیت سے ایسی جامع کتاب پیش کر دے جس کے مقاصد اس قدر ارفع و اعلیٰ ہو کہ اہل عالم کے لیے ترقیات کی راہیں کھولنے والے ہوں پس یہ منہ بولتی کتاب خود اس کے فرستادۂ الٰہی اور رسول ہونے کی سب سے بڑی شہادت ہے۔

اصلاح دینی کے تین ارکان دین اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں جن کو لے کر تمام انبیاء مرسلین دنیا میں آئے اور دنیا والوں کی نیک بختی و سعادت مندی اور کامیابی اس سے تعلق رکھتی ہے کہ وہ انھیں تین چیزوں کو نہایت مستعدی کے ساتھ مضبوط تھامے رہیں۔ خدائے تعالیٰ نے ان "ارکان ثلاثہ" کو ایک عمومی ضابطہ کے طور پر پیش فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا — بیشک جو لوگ مسلمان ہوئے اور جو یہودی ہوئے اور

وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ	نصاری اور صابیہ جو ان میں سے ایمان لایا
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا	اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور نیک کام کیے تو
فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا	ان لوگوں کے لیے ان کا ثواب ان کے پروردگار کے
خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔	پاس ہے اور ان پر کچھ خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین
(بقرہ رکوع)	ہوں گے

بعینہ اسی حقیقت کو دوسرے مقام پر یوں دہرایا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَادُوْا	بے شک جو مسلمان اور یہودی ہیں اور فرقہ صابی
وَالصّٰبِئُوْنَ وَالنَّصٰرٰی مَنْ اٰمَنَ	اور نصاری، جو کوئی ایمان لائے اللہ پر اور قیامت
بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا	کے دن پر اور نیک عمل کرے، نہ ان لوگوں کو ڈر
فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔	ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

(مائدہ رکوع ۱۰)

یہاں پروردگار عالم نے صرف تین باتیں بتلائی ہیں۔ پہلی اللہ پر ایمان لانا۔ دوسری مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر قیامت میں اپنے اعمال کی جزا و سزا پانے پر یقین کرنا۔ تیسری نیک عملی کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک پر ایک سیر حاصل بحث کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ ان میں سے ایک ایک کی پوری حقیقت واضح ہو جائے اور اسلام کے اصول کی فطریت وحقانیت ثابت ہو جائے۔

رکن اول ایمان باللہ ان تینوں میں سب سے پہلا اور مقدم رکن اللہ کی ذات وصفات پر ایمان لانا اور اس کی وحدانیت کا اقرار کرنا ہے اور یہی وہ نظریہ ہے جس میں تمام دنیا کے مذاہب بھٹک گئے قومیں گمراہ ہوکر تباہی و بربادی کے عمیق غاروں میں گر پڑیں یہاں تک کہ وہ قومیں جو خداوندی

پیغام کی مخاطب ہوئیں اور جنہیں ابدی سعادت حاصل کرنے کے لیے روشن احکام و قوانین دیے گئے تھے وہ بھی قعر ذلت میں پڑ گئیں خصوصاً یہودیوں نے تو یہاں تک غضب ڈھایا کہ خدائے تعالیٰ کو انسان کی طرح قرار دے دیا کہ وہ بھی کام کرکے آدمیوں کی مانند تھک جاتا ہے اور کبھی وہ اپنے کیئے پر بھی شرمندہ ہوتا ہے اور یہ بھی یہودیوں کا زعم باطل ہے کہ کبھی کبھی انسانوں کی شکل میں خدا ظاہر ہوتا ہے چنانچہ وہ انسانی شکل میں آیا اور یعقوب علیہ السلام سے کشتی لڑ کر ان کو پچھاڑ نہ سکا آخر کار مجبور ہو کر برکت عطا کر دی

نصاریٰ نے بھی قسطنطین کے عہد میں پرانی بت پرستیوں کو نئے سرے سے شروع کر دیا اور خدا کی زمین کو شرک کی گندگی سے ناپاک کر ڈالا اور ان کی بدتمیزی اس درجہ بڑھ گئی کہ بت پرست قوموں کے ہیکلوں کی طرح خود بھی کنیسے بنا لیے جن میں ہر قسم کے مجسمے تصویریں، مورتیاں بنا کر رکھ لیں اور اس کا سنگ بنیاد تثلیث، کفارہ، اور صلیب کے عقیدہ کو قرار دیا جو اصل میں اجمالی طور پر ہندوستان کے ہندؤں سے لیا گیا تھا۔ مگر تفصیل کے موقع پر "اقانیم ثلاثہ" کے غیر عقلی مفہوم میں ڈھل گیا۔

درحقیقت یہ ایک خیالی فلسفہ ہے جس کو عقل کبھی نہیں مان سکتی صرف عیسائی حکومتوں کے بل بوتے پر اس کو رواج دیا جا رہا ہے اور نہ صرف یورپ کے ممالک میں بلکہ تمام دنیا میں سونے چاندی کی نہریں بہائی جا رہی ہیں۔ بے دریغ سرمایہ لٹایا جا رہا ہے تاکہ اس غیر معقول عقیدہ کو تسلیم کرایا جائے۔ حالانکہ یہ وہ عقائد و خیالات ہیں جن کو کسی دلیل و حجت سے تسلیم نہیں کرایا جا سکتا۔

پس قرآن عزیز نے اس شرک پرستی کی بنیادوں کو کھوکھلا کر ڈالا اور اس کا ذہنی قلعہ مسمار کر دیا تاکہ عقلی دلائل سے خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات کا عرفان حاصل ہو اور توحید الٰہی صحیح طریقہ پر معلوم ہو جائے۔ اس سلسلہ میں جس قدر مخالفوں کے شکوک و شبہات تھے ان کو رفع کیا گیا ہے عقلی تجربی اور خطابی حجتوں سے مختلف عبارتوں میں نہایت دلکش مثالیں دے کر خاص توحید کو انسانی دماغوں میں جڑ دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ دین کا سب سے اہم رکن اور اس کی اولین بنیاد ہے

اس لیے خدائے قدوس کی اس آخری کتاب نے اس زبردست مسئلہ کو بار بار ذکر کیا ہے اور خدائے عزو جل کی ذات وصفات کی یکتائی اور عبادت واستعانت کے لحاظ اس کی یگانگی صاف اور غیر مشتبہ لفظوں میں جتلادی اور اس اعتقاد کو راسخ کر دیا گیا کہ کائنات عالم میں جتنی چیزیں موجود ہیں وہ تمام اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہونے میں برابر ہیں اور خدا کے سوا کوئی نہیں جو کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت رکھتا ہو۔ خود انسان اپنی ذات کو بھی کوئی فائدہ پہنچا نہیں سکتا مگر محض ان اسباب و ذرائع سے جو خدائے تعالیٰ نے اپنی مشیت ازلی سے مسخر کر دئے ہیں۔

غرض کہ خداوند عالم کی توحید بلحاظ اس کی ربوبیت کے یہ ہے کہ پیدا کرنے اور تمام مخلوق کی تدبیر کرنے کے اعتبار سے اس کو یکتا سمجھا جائے اور توحید کی اس قسم کو قرآن حکیم میں بار بار بیان کیا گیا ہے تاکہ عرب کے مشرکین پر حجت قائم ہو جائے جو خدائے برتر کے سوا دوسرے باطل معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور ان معبودوں کو خدا کی بارگاہ میں اپنا سفارشی اور حمایتی جانتے تھے اور رنج و راحت کے موقعوں پر ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کا یہ اعتقاد اسباب و مسببات کے طریق پر نہ تھا بلکہ ان کو وہ حقیقی حاجت روا مشکل کشا جان کر ایسا کیا کرتے تھے اور اپنی تکلیفوں میں انھیں کو پکارتے انھیں کی دہائی دیتے۔ اسی گمراہی کی وجہ سے قرآن مجید نے "دعا" کو سینکڑوں مرتبہ پیش کیا ہے کیونکہ "دعا" ہی عبادت الٰہی کی روح ہے بلکہ عین عبادت اسی کو کہنا درست ہے۔ اس کے علاوہ جتنی عبادتیں ہیں وہ سب اسی سے نکلی ہوئی ہیں۔ لہٰذا یہ حکم دیا گیا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہر رنج و راحت میں پکارا جائے اور غیر اللہ کو پکارنے کی مطلق ممانعت کر دی گئی۔

الحاصل الٰہی بیان کردہ اصول میں توحید کے اثبات کے طریقے، شرک کے باطل کرنے کی دلیلیں اور اس مقصد کے لیے ایسی ایسی تمثیلیں دی گئی ہیں جن سے توحید و شرک دونوں کا صحیح نقشہ انسان کے دل میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور یہ امر بالکل روشن ہو جاتا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے سوا کوئی

نہیں جس کو پکارنا فائدہ پہونچائے اور وہ ہماری پکار کا جواب دے سکے۔ اور جتنی مخلوقات ہیں وہ سب اسی کی فرماں بردار ہیں، اس کا حکم بجا لاتی ہیں۔ ان میں جو سب سے افضل ہیں (یعنی انبیاء کرام اور فرشتے) وہ بھی اسی کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں، اسی کو پکارتے اور اسی کی رحمت کے امیدوار رہتے ہیں اور اسی کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔ ان میں سے کسی میں بھی یہ طاقت نہیں کہ کسی کی حاجت روائی یا فریاد رسی کر سکیں، حتیٰ کہ اذن الٰہی کے بغیر کسی کی سفارش تک کر سکیں۔ جو لوگ مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو، عام اس سے کہ وہ ملائکہ ہوں یا انبیاء یا اولیاء، اپنی حاجتوں کے لیے پکارتے ہیں یا ان کے آگے سرنیاز خم کرتے ہیں، قیامت کے روز ان کے وہ معبود ہی خود ان سے صاف بے زاری کا اعلان کر دیں گے اور اس بات کا بھی اعلان کر دیں گے کہ ہم نے ہرگز ان کو ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا یہی وہ چیز ہے جس کی تفصیل و تشریح اللہ کی سچی کتاب جابجا کرتی ہے۔ اس نے اللہ کی ذات و صفات پر ایمان لانے کے لیے قدرت کی مختلف نشانیاں پیش کی ہیں۔ جو عقیدۂ توحید کے لیے بمنزلہ غذا کے ہیں اور ان روشن نشانیوں پر غور کرنے والے کمال کے مرتبوں پر پہنچ جاتے ہیں۔ خدا کی صحیح معرفت ان کو حاصل ہو جاتی ہے اور خدا کی محبت ان کے دلوں میں اس کے عیوب و نقائص سے منزہ ہونے کی وجہ سے راسخ ہو جاتی ہے اور اُن کے ذہن "اسماء حسنیٰ" کے ذکر سے لذت اندوز ہوتے ہیں یہی سبب ہے جس کے باعث جگہ جگہ احکام شرعی اور قدرتی مظاہر کا ذکر کرنے کے بعد مناسب مواقع پر صفات الٰہی کا قرآن میں تذکرہ کیا گیا ہے کہیں اپنے خلق و تدبیر کی صفت بیان کی تو کہیں حکمت و قدرت اور مشیت کا ذکر فرمایا اور کبھی اپنے حلم و علم کی شان بتلائی اور اس امر کی پوری تاکید کر دی کہ ہر حالت میں خدائے قدیر و توانا سے اپنا رشتہ عبودیت وابستہ رکھیں۔

قرآن عزیز میں توحید کو ایسے دل نشین پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اس سے انسانی ذہن وجد کرنے لگتی ہیں۔ اور اس کی تاثیر سے معرفت کے بلند مراتب پر پہنچ جاتی ہیں۔ چنانچہ ابتدائے سوۃ

حدید میں توحید باری کو نہایت مدلل طریقہ پر پیش فرمایا ہے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ

(سورہ حدید رکوع ۱)

جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ کی پاکیزگی (اپنی زبان حال وقال سے) بیان کررہا ہے اور وہ زبردست حکمت والا ہے، آسمان وزمین کی بادشاہت اسی کے لیے ہے، اور وہی زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے، وہی سب سے پہلا وہی سب سے پچھلا، اور وہی ظاہر اور وہی پوشیدہ، اور وہی ہر چیز کی واقفیت رکھنے والا، اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، جو کچھ زمین میں گھستا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے نیچے اترتا ہے، اور جو کچھ اوپر چڑھتا ہے وہ (ان سب کو) جانتا ہے، تم جہاں کہیں رہو وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے، اور تم جو کچھ عمل کررہے ہو اللہ تعالیٰ اس سے واقف ہے، زمین وآسمان کا وہی بادشاہ ہے، اور سب چیزیں اسی کی طرف لوٹتی ہیں، وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کردیتا ہے، اور وہی دلوں کے بھید دل کو جانتا ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات بتلائی ہے کہ کائنات کی ہر ایک چیز اس کی پاکیزگی

اور تقدیس بیان کر رہی ہے۔ اور اس کی تسبیح کرنے والے ان گنت ہیں تمام فرشتے، زمین پر بسنے والے انسان، اور دنیا کے سارے جانور، درندے، چرندے، پرندے، اور سمندر کی تہ میں بسنے والی آبی مخلوقات، غرض بر و بحر میں کوئی نہیں جو اس کی تسبیح و تہلیل سے غفلت برتے اور اس کی یاد سے بے خبر ہو جائے۔ اگر سننے والوں کے پاس سننے کے ذرائع نہ ہوں، نہ ہوا کریں۔ اس سے یہ کیسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ جب ہماری سمجھ میں نہیں آتا تو فی الواقع بھی ایسا نہیں ہے۔ حالانکہ ابھی کتنے ایسے فطرت کے نوامیس ہوں گے جو انسان کی معلومات سے دور ہیں اور اس کی دست برد سے خارج۔

بہر کیف اس امر کو واضح کرنے کے بعد فرمایا جاتا ہے کہ اے شرک کرنے والو! تم نے کیونکر اس ہستی کے لیے ایسی باتیں تجویز کر رکھی ہیں جو سراپا عیب ہیں اور اس واجب الوجود کی ذات کے کسی طرح لائق و سزاوار نہیں ہو سکتیں بھلا کیونکر ممکن ہے کہ اس کے لیے بیٹے اور بیٹیاں ہوں" اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے کارخانۂ قضا و قدر میں دوسرے شریک ہو جائیں تم نے تو یہاں تک غضب ڈھایا کہ کسی نے خدائے تعالیٰ کو انسان ہی کا ہم شکل بنا دیا اور کوئی یہ ماننے لگا کہ خدا دنیا میں انسانوں کی صورت میں یا جانوروں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے بعض مذاہب عالم میں خدا کو آسمان و زمین بنانے کی وجہ سے تھکا ہوا بتایا گیا ہے اور بعض گمراہ قومیں یہ سمجھتی ہیں کہ خداوند عالم کی ذات تک رسائی ناممکن ہے جب تک اس کے اور بندوں کے درمیان ایسے وسیلے نہ ہوں جو اس تک پہونچا سکیں الغرض ان تمام خیالات باطلہ کو صرف ایک لفظ تسبیح سے اڑا دیا گیا کہ اس کی ذات اقدس تمام واہی تباہی باتوں سے پاک ہے اور اس کی پاکی پر کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی زبان حال سے گواہی دینے میں مصروف ہے پھر اپنی قدرت کے کمال پر نہایت سادہ پیرایہ میں چند دلیلیں ذکر فرمائی ہیں :-

۱۔ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ میں باری تعالیٰ کی تنزیہ ہے یعنی اس کو ہر قسم کی برائیوں اور

عیوب سے بری ثابت کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے دو باتوں کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ جس کی تنزیہ کی جا رہی ہے اس میں قدرت انتہائی ہو اور کوئی نقصان اس کے ارد گرد بھی نہ آ سکے۔ اسی ایک بات میں سینکڑوں امور آ گئے، بیوی بچوں سے پاک ہونا جسمانی خواہشوں اور نفسانی آلایشوں سے پاک ہونا، کیونکہ جو وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے تو اس کو دوسرے مددکرنے والوں یا کسی قسم کے آلات و وسائل کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ دوسری بات یہ ہے کہ قادر ہونے کے ساتھ ہی حکمت سے بھی متصف ہو تاکہ اشیاء عالم میں ان کے مناسب تدبیروں سے کام لے، اس لیے کہ اگر حکمت نہ ہو گی تو اتنی بڑی کائنات کے بے حد و حساب معاملات کی تدبیر کرنا کسی طرح ممکن نہ ہوگا۔ پھر ہر چیز کی حقیقت کا علم کلی بھی ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ بے خبری کے ساتھ تدبیر صحیح غیر ممکن ہے۔ اسی واقفیت کا نام "حکمۃ" ہے اور انھیں دو چیزوں کو العزیز اور الحکیم کے الفاظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔

۲۔ اب رہی یہ چیز کہ یہ دونوں باتیں اس کی ذات میں موجود بھی ہیں یا نہیں اس کے لیے اپنے مالک ہونے کا تذکرہ فرمایا ہے جس سے مخلوقات میں اس کا متصرف ہونا واضح ہو رہا ہے۔

۳۔ یہ کہ اس کے قبضہ میں ساری دنیا کی باگ ڈور ہے۔ وہی ساری مخلوقات کو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اگرچہ دنیا کے عالم اسباب ہونے کی وجہ سے مرنا جینا طبعی اسباب کی طرف بظاہر منسوب کر دیا جاتا ہے لیکن جتنی اشیاء موجود ہیں ان کا موجود ہونا اور نہ ہونا سب کی انتہا اُسی کی طرف ہو جاتی ہے اگر ذرا سی بھی عقل ہو تو یہ فطری بات فوری سمجھ میں آ جائے گی اور کہنا پڑے گا کہ وہی ہستی مارتی اور جلاتی ہے جس کے قبضۂ قدرت میں دنیا کا پیدا کرنا ہے۔ ایسی ہستی کی بادشاہت میں کسی کو دم مارنے کی کیا مجال ہو سکتی ہے؟ قرآن عزیز کی بلاغت اس جگہ نہایت درجہ قابل لحاظ ہے یُحْیِي وَيُمِيتُ کہہ کر یہ جتلا دیا کہ تم روز کے روز اپنی نظروں کے سامنے اس کا

عینی مشاہدہ کر رہے ہو۔

۴۔ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ یعنی اس کی قدرت کاملہ کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہر ایک پر اس کو پوری دسترس حاصل ہے۔

اس کے بعد ایسی چار صفات ذکر فرمائی گئی ہیں جن سے یہ مضمون بدرجۂ اتم واضح ہو جاتا ہے اور ایک انصاف پسند کے لیے کوئی حیلہ باقی نہیں رہتا۔

۵۔ "هُوَ الْاَوَّلُ" وہی سب سے پہلے ہے، اس سے پہلے کوئی نہیں کیونکہ کائنات کا ایجاد کرنے والا وہی ہے اور اپنی ذات و صفات کے اعتبار سے وہی قدیم ہے، اس کے سوائے جو کچھ بھی ہے پہلے نہ تھا۔ اس کے پیدا کرنے کے بعد ہی عالم وجود میں جلوہ گر ہوا۔

۶۔ هو الاٰخر۔ یعنی اسی طرح وہ آخر بھی ہے۔ سب کے فنا ہو جانے کے بعد بھی رہے گا اور اس کی ہمشگی و ابدیت کی کوئی حد و غایت نہیں ہے۔

۷۔ الظاہر والباطن۔ وہی سب پر غالب اور بلند و برتر ہے اور موجودات عالم میں اس کی تجلیاں ایسی ظاہر ہو رہی ہیں کہ غور و فکر سے کام لینے اور دیکھنے بھالنے سے ضرور اس تک پہنچنے کے راستے مل جاتے ہیں اور اس بارگاہ اقدس تک رسائی ہو جاتی ہے۔ اس کا وجود ایسا ظاہر ہے کہ کوئی اس کی طرح ظاہر نہیں۔ حقیقت بیں نگاہوں سے چاروں طرف نظر ڈالو تو آفاق و انفس میں اسی کی جلوہ فرمائیاں دیکھو گے، یہ اور بات ہے کہ تمہاری نظروں کی کوتاہی، اور تمہاری نگاہوں کی تنگ دامنی، اس کے حسن و جمال کی رعنائیوں کو نہ پا سکے، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اتنا ہی انسانی عقل و خرد کی رسائی سے دور، مادی آنکھوں سے چھپا ہوا اور اجل ہے کہ نہ کوئی انسان اس کو دیکھ سکے اور نہ اس کی کنہ و حقیقت تک پہنچ سکے۔ مگر با ایں ہمہ وہ ہر چیز پر اس طرح احاطہ کیے رہے ہے کہ فرش سے عرش تک اس کی نشانیاں، قدرت و حکمت کی نیرنگیاں اپنی پوری نمود و نمایش کے ساتھ

رونق افروز او بہجت افزا ہیں، یہ سب کچھ "الظاہر والباطن" کی تشریح تھی آگے چل کر "وھو بکل شئی علیم" کہا ہے جس سے الحکیم کی حقیقت بھی بالکل واضح ہوگئی گویا کہ یہ اسی کا تتمہ تھا۔

ان دلائل کے بعد چند ایسے حقائق پیش کیے جاتے ہیں جن سے گزرے ہوئے اور آنے والے زمانے میں پروردگار عالم کی قدرت وحکمت کا کمال ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ "ھو الذی خلق السمٰوٰت والارض" میں یہ تبلانے کے بعد کہ آسمان وزمین کو پیدا کیا یہ بھی جتلایا جاتا ہے کہ "ثم استویٰ علی العرش" یعنی اس کا قبضہ واقتدار اس طرح پر ہے کہ اس کے احاطہ سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں ہے "یغشی اللیل والنہار" سے اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور کہیں "یدبر الامر" سے تعبیر فرمایا ہے۔

عام طور پر دنیا کا دستور ہے کہ بادشاہوں کی تخت نشینی ہوتی ہے تو اس کی ایک تو ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک معنوی غرض وغایت، یعنی سلطنت کے تمام امور پر اس طرح قبضہ کر لینا کہ کوئی فرمان شاہی سے سرتابی نہ کرسکے۔

پھر اس کے بعد اپنی صفات جلیلہ میں سے علم، احاطہ اور حکمت کا اظہار "یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو معکم اینما کنتم واللہ بما تعملون بصیر" سے فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اُن تمام چیزوں کو جانتا ہے جو زمین کے اندر گھس جاتی ہیں مثلاً پانی، تخم ریزی، دفینے خزینے، اور مردوں کی لاشیں۔ یا جو زمین سے نکل آتی ہیں جیسے سبزیاں، غلے، درخت اور معدنیات میں سے لوہا، پتیل، سونا، چاندی یا جو آسمان سے نازل ہوتی ہیں خواہ بارش ہو یا رحمت الٰہی، یا رحمت کے فرشتے ہوں یا عذاب کے اسی طرح وہ اُن چیزوں کو بھی جانتا ہے جو نیچے سے اوپر کو چڑھتی ہیں خواہ ملائکہ ہوں یا بندگان خاص کی وہ روحیں جو اپنے بدن کی کثیف چادریں اتار کر ملاء اعلیٰ سے جاملتی ہیں،

یا وہ لطیف بخارات ہوں جو زمین سے اوپر کو چڑھتے ہیں او دل بن کر برستے ہیں؟ انہیں چیزوں پر کیا موقوف ہے وہ تو ہر حال میں تمہارے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ خواہ تم کہیں ہو اور وہی تمہارے اچھے برے اعمال سے باخبر ہے۔

پھر سابق مضمون کو ایک دوسرے پیرایۂ بیان میں پیش کیا گیا ہے "لہ ملک السموٰتِ والارض" یعنی کائنات علوی وسفلی کی تمام چیزیں اس کی مملوک اور تابع فرمان ہونے کے اعتبار سے اسی کی عالمگیر قدرت کے ماتحت ہیں اور جتنے امور ہیں خواہ حسی ہوں یا معنوی، روحانی ہوں یا مادی سب کے اسباب کی انتہا اسی کی بارگاہ قدس تک ہوتی ہے اور ان سب کا حقیقی سبب الاسباب وہی ہے۔

غرض کہ ساری کائنات ومافیہا کا مرکز اصلی اسی کی ذات مبارکہ ہے جس کی طرف لوٹنا یقینی ہے اگر اس میں تمہیں کچھ شک وشبہ ہو تو روزانہ گردش لیل ونہار کو دیکھ لو خود بخود یہ باتیں سمجھ میں آجائیں گی۔ ان تمام امور کی بوجہ اتم صراحت ووضاحت کر دینے کے بعد حقیقی اور اصلی مقصد کی طرف دعوت دی جاتی ہے۔ "آمنوا باللہ ورسولہ۔"

اسی طرز پر سورۂ حشر کے اخیر میں توحید الٰہی کے مسئلہ پر نہایت موزوں طور پر عجیب انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ	وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غیب
الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ	شہادت کا جاننے والا بڑا ہی مہربان، بہت ہی رحمت
هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْمَلِکُ	والا، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں،
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ	وہ بادشاہ پاک ذات، سلامتی والا، امن دینے
الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ	والا، نگہبان، زبردست، دباؤ والا، کبریائی

عَمَّا يُشْرِكُوْنَ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ
لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورہ حشر ۴)

والا۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جنہیں وہ اس کے ساتھ
شریک کر رہے ہیں، وہی اللہ پیدا کرنے والا صورتیں
بنانے والا ہے، اسی کے لیے اسمار حسنیٰ ہیں اسی کی تسبیح میں مصروف
ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے۔

ان آیتوں میں خدائے عز و جل نے اپنی ذات و صفات کا ذکر فرمایا ہے جس سے اس کی عظمت و کبریائی اور اس کے جلال و جبروت کی شان انسانی دماغ میں کچھ اس طرح سما جاتی ہے کہ وہ کسی دوسری طرف متوجہ ہی ہونے نہیں پاتا یعنی وہی خدائے برحق معبود حقیقی ہے جس کے سوائے کوئی نہیں جو عبادت کے لائق ہو سکے وہی آسمانوں کا پیدا کرنے والا، زمین کو فرش کی طرح بچھا دینے والا اور جتنی بھی آسمان و زمین کی چیزیں ہیں سب کا پیدا کرنے والا ہے۔ صفات کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ ہر چھپی ہوئی اور ہر کھلی ہوئی بات کا جاننے والا ہے، یہاں لفظ "الغیب" استعمال کیا گیا ہے جو اپنی معنوی حیثیت سے نہایت وسیع اور جامع ہے، نہ صرف وہ جو انسان کے حواس خمسہ سے غائب ہے بلکہ جو فرشتوں کی نگاہوں سے غائب ہے وہ بھی غیب ہے۔ ملاء اعلیٰ اور عالم قدس انسان کے اعتبار سے غیب ہے۔ اسی طرح اور بہت سے عالم ہیں جو انسان سے اوپر والی مخلوق کے لحاظ سے بھی غیب ہیں غرض یہ ہے کہ ہر ایک چیز اس کے تحت داخل ہو جاتی ہے کیونکہ بے شمار چیزیں ہیں جو فرشتوں سے بھی دور ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے علم ازلی سے کوئی ذرہ خارج نہیں غیب کے مراتب اضافی و نسبی حیثیت سے سیکڑوں نکلتے چلے جائیں گے، اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ غیب جو کہا گیا ہے وہ مخلوقات کی نسبت سے ہے ورنہ اس کیلئے تو ساری کائنات اور کائنات کا ذرہ ذرہ شہادت ہی شہادت ہے۔ اور اس کے یہاں سب کچھ عیاں ہے کوئی اس سے پوشیدہ نہیں۔

الرحمٰن الرحیم۔ یہ دونوں لفظ رحمت سے نکلے ہوئے ہیں اور دونوں مبالغہ کے

صیغے ہیں لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے جس کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ذکر فرما دیا ہے "یارحمٰن الدنیا ورحیم الاخرۃ" اے دنیا کے رحمٰن اور آخرت کے رحیم! اس جگہ رحمان کی اضافت دنیا کی طرف کی گئی ہے اور رحیم کی آخرت کی طرف، کیونکہ دنیا کی بڑی بڑی نعمتیں اور لذتیں بھی آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہیں غرض رحمٰن میں کمیت کے اعتبار سے اور رحیم میں کیفیت کے اعتبار سے رحمت کا مبالغہ ہے۔

اور رحمت کے وہ معنی جو ہماری سمجھ میں آتے ہیں یہ ہیں کہ وہ ایک باطنی جذبہ ہے جو کسی کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اسی کے پیدا ہونے کے سبب ایک انسان دوسرے انسان پر احسان کرتا ہے ظاہر ہے کہ یہ معنی تو خدائے تعالیٰ کی ذات پر اطلاق نہیں کیے جا سکتے۔ پس خدا کے لیے جب رحمت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے رحمت کا نتیجہ اور اثر مراد ہوتا ہے یعنی احسان کرنا۔

"الملك" وہ ہے جو اپنی ذات وصفات میں تمام موجودات سے بے پروائی وبے نیازی پوری پوری رکھتا ہو اور تمام موجودات اپنے وجود وبقا کے لحاظ سے اس کی سراپا احتیاج ونیازمندی ہوئی ہوں۔

جب انسان کو اس صفت الٰہی کا ادراک حاصل ہو جاتا ہے کہ حقیقی بادشاہ صرف خدائے تعالیٰ ہی ہے تو انسان اسی کی درگاہ احدیت کا ہو رہتا ہے۔ اسی کی طاعت وفرمانبرداری کرنے لگتا ہے، اور ہر دوسری چیز سے بے نیاز ہو کر اپنی حاجتوں اور ضرورتوں میں اسی کا دروازۂ رحمت کھٹکھٹاتا ہے۔ اس کے سوائے کسی دوسرے کے آگے التجائیں پیش نہیں کرتا پھر جو انسان اس صفت خداوندی کا مظہر بن جائے اور اس کے رنگ میں اپنے ظاہر وباطن قلب وقالب کو رنگ دے تو وہ ساری قوتوں پر غلبہ وتسلط حاصل کر کے ان کو فطرت سلیمہ کے تابع کر لیتا ہے۔

"القدوس" یعنی بے حد پاک اور ہر نقص وعیب سے بری، ہر قسم کے وہم وگمان۔

اور خیالات سے بالاتر اور انسانی ادراک کے طائر فکر و نظر سے بلند انسان پر اس صفت ربانی کا جب پرتو پڑتا ہے تو وہ بھی اپنے احاطۂ احساس اور حیطۂ تخیل سے بالکل الگ ہوجاتا ہے یہاں تک کہ اس کا علم، علوم الٰہیہ سے کچھ ایسا وابستہ ہوجاتا ہے کہ کسی حال میں اس کا سررشتہ ہاتھ سے نہیں چھوٹنے پاتا اور اس کی قوت ارادی اس درجہ پاکیزہ ہوجاتی ہے کہ نفسانی خواہشات وجذبات بھی اس کے تابع ہوکر مرضیٔ الٰہی کے تحت ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

"السلام" وہ ہر اس چیز سے جو عیوب و نقصانات کے قبیل سے ہو بالکل بری اور سالم ہے اور دوسروں کو سلامتی دینے والا ہے۔ وہ دنیا میں بھی اپنی آغوش رحمت میں آنے والوں کو سلامتی بخشتا ہے۔ اور آخرت میں بھی دارالسلام یعنی سلامتی کے گھر میں داخل فرمائے گا۔ اس صفت الٰہیہ سے جو متعلق ہوجائے وہ ہر قسم کی باطنی برائیوں سے محفوظ ہوگا اور حسد و بغض، کینہ اور ہر طرح کی خباثت علمی و عملی بہیمیت کے آثار سے پاک و صاف ہوکر صاحب قلب سلیم ہوجائے گا اور تقرب الٰہی کا بلند مرتبہ حاصل کرے گا۔

"المومن" وہ ذات ہے جس نے دنیا و آخرت میں ہر تکلیف و مصیبت سے بچنے کے لیے مختلف ذرائع و اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ مثلاً دنیا کی زندگی کے لیے جسمانی امن و حفاظت کا انتظام کیا ہے وہ مواد پیدا کیا ہے جو زندگی کا سامان بہم پہنچانے کے لیے ضروری ہے۔ وہ قوتیں دی ہیں جن کے ذریعہ سے اس مواد کو استعمال کیا جاسکتا ہے۔ وہ طریقے سکھائے ہیں جن سے مادیات کو مسخر کیا جاسکتا ہے۔ اور ان سے اپنے فائدے کے لیے کام لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس نے روحانی امن و امان کے واسطے بھی اپنے پیغامبر مبعوث فرمائے، ان پر کتابیں نازل کیں جن میں انسانی ضروریات اور مصالح کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی تاکہ معادی و معاشی ہر قسم کے مقاصد کے لیے دلیل راہ ہوں اب انسان کا فرض یہ ہے کہ وہ اس صفت کا مظہر بن کر دنیا و آخرت میں مامون ہوجائے۔

المھیمن۔ انسانی اعمال کی پوری حفاظت ونگرانی کرنے والا اور ان کے سامان رزق وضروریات زندگی کی نگہداشت کرنے والا۔ جب خدائے تعالیٰ کی یہ صفت ہے تو انسان کو چاہیے کہ اپنی تمام خدا داد فطری قوتوں کی نگرانی کرنے والا بن جائے کہ کوئی قوت فطری عدم استعمال کی وجہ سے ضائع نہ ہونے پائے یا کوئی قوت بے محل صرف ہو کر حد اسراف کو نہ پہنچ جائے۔ غرض اپنے قوائے کا مشکی حفاظت ونگہبانی انسان کو اس صفت کا مظہر بنا دیتی ہے۔

"العزیز"۔ عزیز ایک ایسی صفت ہے جس میں تین باتیں پائی جاتی ہیں پہلی یہ کہ جس کی یہ صفت ہے اس کی نظیر کم ہو۔ دوسری یہ کہ اس کی ذات سے سب کی حاجتیں متعلق ہوں، تیسری یہ کہ اس تک پہنچنا بہت دشوار ہو۔ یہ تینوں امور باری تعالیٰ میں پورے طور پر پائے جاتے ہیں، اس کی نظیر کم ہونا تو کیا بالکل ہے ہی نہیں، اور کائنات کی ہر شئے اپنے موجود ہونے اور باقی رہنے میں اسی کی محتاج ہے، اور اس کی عنایت کے بغیر اس کی بارگاہ عالی تک رسائی ہو نہیں سکتی۔ پس جس شخص کے دل ودماغ میں "عزیز" کی عزت رچ جائے گی وہ پھر کسی غیر اللہ سے عزت طلبی کا خواہاں نہ ہوگا۔ اور ضرور ہے کہ وہ عزت وسربلندی کے مرتبہ پر فائز ہو جائے اور شان "مالك الملك تُؤتی الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ" کا ظہور ہو۔ بہرکیف عزت یا تو خدا کے لیے ہے یا اس کے دیئے ہوئے کے لیے ہے، "للهِ العزة ولرسوله وللمؤمنین"۔

"الجبار"۔ جبار جبر سے مشتق ہے۔ یہ اس ذات کی صفت ہے جس کا جبر وقہر تو ہر ایک پر ہو سکتا ہے مگر کسی کا جبر اس پر نہیں ہو سکتا اور کوئی نہیں جو اس کی قدرت وارادہ سے باہر ہو یا اس کے قبضہ سے نکل سکے "لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ"۔

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند | عالمے را در دمے ویراں کند

انسانوں میں سے جباریت کا مظہر وہ ہو سکتا ہے جو سب کا اس طرح متبوع بن جائے کہ اس کا

اتباع کرنا ہر ایک کے لئے جبری طور پر لازمی ہو اور اس میں تاثر کی صفت نہ ہو بلکہ تاثیر رکھتا ہو کہ جو اس کو دیکھے متاثر ہو جائے، یہ خاص کیفیت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں پائی جاتی ہے کہ آپ تمام دنیا والوں کے لیے حقیقی متبوع بنا کر بھیجے گئے ہیں اور آپ ہی کو ساری اولاد آدم کی سیادت کا فخر حاصل ہے۔ اور جن لوگوں نے آپ کو دیکھا وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنی جان اور اپنا مال آپ کی محبت و رفاقت میں ہیچ سمجھا اور سب کچھ آپ کی خاطر چھوڑنا گوارا کر لیا تاریخ اسلام شاہد ہے کہ صحابۂ کرام کی حالت ایسی ہی تھی ۔۔

"اَلْمُتَکَبِّرُ" شان تکبر و کبریائی کے لائق وہی ذات اقدس ہو سکتی ہے جس کے مقابلہ میں کائنات عالم کی ہر چیز حقیر ہو۔ اور کوئی اس کے سامنے اپنی بڑائی نہ جتلا سکے بلکہ سب اس کے آگے عاجز و درماندہ و محتاج و نیاز مند ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ خداوند تعالیٰ کے سوائے کسی کے لیے تکبر درست نہیں ہو سکتا یہی وجہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اللہ کے آگے تواضع و انکساری اختیار کرے گا اس کو اللہ تعالیٰ ضرور سرفراز و سربلند فرمائے گا۔ اور جو کبریائی اختیار کرے گا وہ ذلیل و خوار ہوگا۔

"الخالق، الباری، المصوّر"۔ خلق، براء اور تصویر یہ تینوں صفات قریب قریب ایک ہی مفہوم ادا کر رہی ہیں مگر ذرا فرق بھی ہے "خلق" پیدا کرنے سے پہلے اندازہ کر لینے کو کہتے ہیں "براء" مطلقاً پیدا کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اور "تصویر" صورت دینے کو کہتے ہیں ما للہ تعالیٰ نے یہ تینوں درجے کائنات کو ایک ہی وقت میں طے کرا دیے ہیں۔ مگر رتبہ کے لحاظ سے ایک دوسرے پر مقدم ہے

"الحکیم" حکمت کے معنی کسی بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعہ پہچان لینے کے ہیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ خداوند قدوس کی کنہ اور اس کی ذات کوئی نہیں جان سکتا پس یہی چیز بہترین ہے اور حکیم علی الاطلاق اس کے سوائے کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا اگر کسی پر یہ لفظ بولا جائے گا تو اس

معنی میں ہوگا کہ اس پر اس صفت الہیہ کا پرتو پڑا ہے۔ اسی لیے جب انسان خداوندی علم و حکمت کا مظہر بن جاتا ہے تو اس پر بھی فیضان الٰہی ہونے لگتا ہے اور وہ "مَنْ یُّؤْتَ الْحِکْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا" کا مصداق بن جاتا ہے اور یہی مطلب ہے "وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّھَا" کا کہ فطرت آدم میں جو علوم حکمت کے خزانے فاطر کائنات نے ودیعت رکھے ہیں، وہی اپنے اپنے وقت پر بروئے کار آ رہے ہیں۔ تو گویا اسی کی ذات تمام حکمتوں کا سرچشمہ ہے۔

چونکہ گذشتہ آیتوں میں بہت سے اسماء حسنیٰ آگئے تھے اس لیے ان کی کسی قدر تشریح کر دینی ضروری تھی نیز اس لیے بھی ایسا کیا گیا کہ وحدت صفات کے مسئلہ میں بہت غلطیاں کی گئی ہیں اور درحقیقت یہیں سے غلطی کا نقطۂ آغاز ہے کیونکہ گمراہ قوموں نے ہر کام اور ہر صفت کے لحاظ سے ایک ایک معبود قرار دے رکھا تھا حالانکہ ان صفات متعددہ کا ایک ہی ذات میں اجتماع ہے۔

غرض قرآن مجید نے نہ صرف توحید ذاتی کو بیان کیا ہے بلکہ صفات و افعال کے لحاظ سے بھی مسئلۂ توحید کی وضاحت کر دی ہے۔ اور وحدت صفات باری کی گتھی کو بالکل سلجھا کر رکھدیا ہے۔

باقی

تقلید و اتباع

از افادات علامہ ابن القیم رحمۃ اللہ

تقلید کی تین قسمیں ہیں۔ ایک قسم کی تقلید حرام ہے۔ دوسری واجب ہے۔ اور تیسری جائز ہے مگر واجب نہیں۔

تقلید حرام کی بھی تین قسمیں ہیں۔

ایک یہ کہ بزرگوں سے جو طریقہ چلا آتا ہو، انسان اسی کی پیروی کیے چلا جائے اور سرے سے اس بات کی تحقیق ہی نہ کرے کہ خدا اور رسول کا حکم کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ انسان کسی ایسے شخص کی تقلید کرے جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ آیا وہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کی بات مانی جائے۔

تیسرے یہ کہ انسان کسی شخص کی تقلید کا ایسا پابند ہو کہ جب اس کے قول کے خلاف دلیل و حجت قائم ہو جائے تب بھی وہ اسی کی پیروی پر جا رہے۔ اس تیسری قسم کے مقلد اور پہلی قسم کے مقلد میں فرق یہ ہے کہ پہلا شخص تو علم نہیں رکھتا اس لیے تقلید کرتا ہے، اور یہ علم رکھتا ہے، حجت اس پر ظاہر ہو جاتی ہے، پھر بھی تقلید کی بندش سے نہیں نکلتا۔ اس لحاظ سے یہ زیادہ لائق مذمت ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنی کتاب پاک میں متعدد مقامات پر ان تینوں قسم کی تقلیدوں کی برائی بیان فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ

اور جب ان سے کہا گیا کہ پیروی کرو اس حکم کی جو خدا نے نازل کیا ہے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم تو

اٰبَآءَنَا ۚ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (البقرہ: ۲۱)

اسی طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگر ان کے باپ دادا کچھ نہ جانتے ہوں اور طریقۂ ہدایت پر نہ ہوں تب بھی کیا وہ انہی کی پیروی کیے جائیں گے؟

وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (الزخرف: ۲)

اور ایسا ہی ہوتا رہا ہے کہ جب ہم نے تم سے پہلے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس بستی کے خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقہ پر پایا اور ہم انہی کے قدم بہ قدم چلے جا رہے ہیں۔ اور پیغمبر نے ان سے کہا کہ اگر میں تمہارے باپ دادا کے طریقہ سے بہتر طریقہ تمہیں بتا دوں تو کیا پھر بھی تم انہی کی پیروی کیے چلے جاؤ گے؟

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (المائدہ: ۱۴)

اور جب کبھی ان سے کہا گیا کہ آؤ اس چیز کی طرف جو خدا نے اتاری ہے اور آؤ رسول کی طرف تو انہوں نے یہی کہا کہ ہمارے لیے وہ طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

اس مضمون کی دوسری آیات بھی قرآن میں بکثرت وارد ہوئی ہیں جن میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو تقلید اسلاف پر قناعت کر لیتے ہیں اور خدا کی نازل کی ہوئی ہدایت کی طرف توجہ نہیں کرتے[1]۔

---

[1] اگر کوئی یہ کہے کہ ان آیات میں تو ان لوگوں کی مذمت کی گئی ہے جو اپنے گمراہ اور کافر اسلاف کی پیروی کرتے تھے، پھر تم نے کس طرح ان آیات کو ایسے لوگوں پر چسپاں کر دیا جو علماء مہتدین کی پیروی کرتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے خود حکم دیا ہے کہ جو کچھ تمہیں معلوم ہو اسے اہل علم سے پوچھو۔ فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دراصل تقلید کی اس نوعیت کو برا ٹھیرایا ہے کہ انسان خدا کی

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ اور یہ ظاہر ہے کہ تقلید علم نہیں ہے۔ جیسا کہ اہل علم بالاتفاق کہتے ہیں ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :-

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف : ۴)

کہو کہ میرے پروردگار نے تو حرام کیا ہے بے حیائی کے کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور گناہ کو اور ناروا زیادتی کرنے کو اور اس بات کو کہ تم خدا کے ساتھ کسی ایسی چیز کو شریک ٹھیراؤ جس کے لیے اس نے کوئی دلیل نہیں اتاری اور یہ کہ تم خدا کے بارے میں کوئی ایسی بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں ۔

اور ایک جگہ فرمایا :-

اِتَّبِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَاءَ (الاعراف ۱)

پیروی کرو اس ہدایت کی جو تمہاری طرف تمہارے پروردگار سے نازل ہوئی ہے اور اس کے سوا اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کی پیروی نہ کرو ۔

اس آیت میں صرف خدا کی نازل کردہ ہدایت کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے اور مقلد کا حال یہ ہے کہ وہ جانتا ہی نہیں کہ جس چیز کی پیروی وہ کر رہا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں۔ بلکہ ایک قسم کا مقلد

تکملہ حاشیہ صفحہ ۴۷ نازل کی ہوئی ہدایت سے بے پروا ہو کر انسانوں کی پیروی کرنے لگے۔ تقلید کی یہی نوعیت ہے جس کے مذموم اور حرام ہونے پر سلف صالح اور ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔ رہی یہ تقلید کہ کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے اتباع کی کوشش کرے اور اسکے احکام کو سمجھنے میں ایسے لوگوں کی طرف رجوع کرے جو اس سے زیادہ علم رکھتے ہوں تو ایسی تقلید مذموم نہیں محمود ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم تقلید واجب اور تقلید جائز کی بحث میں بیان کریں گے ۔

تو ایسا ہے کہ جب دلیل و حجت سے اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس کے پیشوا کا قول خدا کی نازل کردہ ہدایت کے خلاف ہے تب بھی وہ اس کی پیروی سے باز نہیں آتا۔ پس یہ کھلا ہوا اتباعِ غیر منزّل ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا (النساء : ۸)

پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اس میں خدا اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرو اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو یہی طریقہ بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی اچھا ہے۔

اس آیت میں ہم کو اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی اور کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا گیا ہے اس سے بھی تقلید کا ابطال ہوتا ہے۔

پھر فرمایا:۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ وَلِيجَةً (التوبہ : ۲)

کیا تم نے یہ گمان کیا ہے کہ تم چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تک آزما کر نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور اللہ اور اس کے رسول اور جماعت مومنین کے سوا کسی غیر کو اپنا معتمد علیہ نہیں بنایا۔

اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھکر ولیجہ[1] اور کیا ہوگا کہ کوئی شخص کسی کو اللہ اور اس کے رسول اور تمام امت کے کلام پر مختار کل بنا دے، اور ان سب پر اس کو مقدم ٹھیرائے، اور کتاب اللہ، سنت رسول، اجماع امت، سب کو اُس کے قول پر پیش کرے، پھر ان میں سے جو کچھ اس کے قول کے موافق ہو اس کو اس بنا پر قبول کرے کہ وہ اس کے موافق ہے، اور جو اس کے قول کے خلاف ہو اسے رد کرنے کے لیے حیلے تلاش کرے، دلیلیں ڈھونڈے، اور کسی نہ کسی بہانے سے اس کو رد کر کے ہی چھوڑے۔ اگر یہ بھی ولیجہ نہیں

[1] ولیجہ اس کو کہتے ہیں جس کو انسان اپنا معتمد علیہ بنائے۔

تو ہم نہیں جانتے کہ پھر ولیجہ اور کیا چیز ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يٰلَيْتَنَا أَطَعْنَا اللّٰهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ۝ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ۝ (الاحزاب: ۸)

جس دن آگ میں ان کے چہروں کو الٹ پلٹ کیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ اے کاش ہم اطاعت کرتے اللہ کی اور اطاعت کرتے رسول کی اور وہ کہیں گے کہ پروردگارا! ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑے لوگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہم کو گمراہ کر دیا۔

یہ آیت بھی تقلید کا بطلان کرتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس میں تو ایسے لوگوں کی مذمت ہے جو گمراہ کرنے والوں کی تقلید کریں، پھر تم نے اسے ان لوگوں پر کیوں چسپاں کر دیا جو راہ راست کی طرف ہدایت کرنے والوں کی تقلید کرتے ہیں؟ تو ہم کہیں گے کہ اس کا جواب خود سوال ہی میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ ہدایت اس کے سوا کچھ نہیں جسے اللہ نے نازل کیا اور اس کے رسول نے بیان فرمایا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی شخص کے ہادی و مہتدی ہونے کا صحیح علم اسی کو ہو سکتا ہے جو خود ہدایت کا علم رکھتا ہو۔ اب اگر کوئی شخص یہ علم رکھتے ہوئے کسی کو ہادی و مہتدی جانتا ہے اور اس کی پیروی کرتا ہے تو وہ مقلد ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ اس علم سے بہرہ ور نہیں تو اسے یہ معلوم ہی کیونکر ہوا کہ کون راہ راست کی طرف ہدایت کرتا ہے اور کون راہ کج کی طرف۔ وہ تو خود اپنے اقرار کے بموجب جاہل اور گمراہ ہے۔ کتاب و سنت کے علم سے ناواقف ہو کر وہ جس کی بھی پیروی کرے گا اندھی پیروی کرے گا۔ اس کا رہبر جدھر جدھر جائے گا وہ بھی اندھوں کی طرح اس کے پیچھے چلا جائے گا۔ خواہ وہ سیدھے راستہ پر جائے یا غلط راستہ پر۔

مقلدین کہتے ہیں کہ دین کے معاملات میں جن ائمہ کی ہم تقلید کرتے ہیں ان کے ہدایت پر ہونے کا تم خود اقرار کرتے ہو۔ پھر جب وہ ہدایت پر ہیں تو ان کی تقلید کرنے والے بھی قطعاً ہدایت پر ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا ان کے پیچھے آنکھیں بند کر کے چلنا خود اُن کے اپنے طریقے کے بھی تو قطعاً خلاف ہے ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ حجت کا اتباع کرتے تھے اور اندھی پیروی سے روکتے تھے، جیسا کہ ہم آگے چل کر خود انہیں کے اقوال سے ثابت کریں گے۔ پس جو شخص حجت کو ترک کرتا ہے اور اُس چیز کا ارتکاب کرتا ہے جس سے خود انہوں نے اور ان سے پہلے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے، وہ یقیناً ان کے طریقہ پر نہیں ہے بلکہ ان کا مخالف ہے۔ ان کے طریقہ پر تو وہی شخص ہے جو حجت کا اتباع کرے اور دلیل کے آگے سر جھکائے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی انسان کو کتاب وسنت پر مختار نہ ٹھیرائے۔

یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جو شخص تقلید اور اتباع کو ایک چیز قرار دیتا ہے وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے یا قصداً تلبیس کرتا ہے۔ تقلید دراصل اتباع سے مختلف چیز ہے۔ خود اللہ اور اس کے رسول نے ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے اور اہل علم نے ہمیشہ اس فرق کو ویسا ہی ملحوظ رکھا ہے جیسا کہ ان دونوں کی حقیقتوں میں فرق ہے۔ اتباع کے معنی یہ ہیں کہ تم نے جس شخص کو اپنا پیشوا ٹھیرایا ہے اس کے طریقہ پر چلو اور جو کچھ وہ کرتا تھا وہی تم کرو۔ علامہ ابن عبدالبر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں ایک مستقل باب اس موضوع پر لکھا ہے جس کا عنوان ہے۔ فساد التقلید ونفیہ والفرق بینہ وبین الاتباع۔ اس میں انہوں نے تقلید اور اتباع کے فرق پر خوب بحث کی ہے۔ لکھتے ہیں:

"اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات پر تقلید کی مذمت کی ہے۔ مثلاً فرمایا۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ [1] حضرت حذیفہ اور دوسرے بزرگوں سے مروی ہے کہ اس آیت میں احبار اور رہبان کو خدا بنا لینے سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ لوگ خدا کو چھوڑ کر ان کی عبادت کرنے لگے تھے، بلکہ مراد

[1] انہوں نے اپنے احبار (علماء) اور رہبان (مشائخ) کو خدا کے بجائے اپنا رب بنا لیا۔

یہ ہے کہ انہوں نے خدا کی کتاب اور اس کے احکام سے بے پروائی اختیار کی اور اپنے احبار اور راہبوں پر اتنا اعتماد کر لیا کہ جس چیز کو انہوں نے حلال ٹھیرا دیا اسے حلال اور جس کو حرام ٹھیرا دیا اسے حرام سمجھنے لگے۔ عدی بن حاتم کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب حاضر ہوا تو میرے گلے میں صلیب لٹکی ہوئی تھی حضور نے فرمایا اے عدی اس کو پھینک دے یہ بت ہے۔ حضور اس وقت سورۂ براۃ تلاوت فرما رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے جب آپ اس آیت پر پہنچے اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ تو میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ہم نے تو ان کو خدا نہیں بنایا۔ حضور نے فرمایا "ضرور بنایا ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ خدا نے جسے حرام ٹھیرایا اسے تمہارے احبار و رہبان حلال ٹھیرا دیتے ہیں اور تم اسے حلال مان لیتے ہو، اور خدا نے جسے حلال ٹھیرایا اسے وہ حرام کر دیتے ہیں اور تم اس کو حرام سمجھ لیتے ہو؟" میں نے عرض کیا یہ تو صحیح ہے۔ آپ نے فرمایا "بس یہی ان کی عبادت اور بندگی ہے"[۱] ابو البختری نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اگر ان کے احبار اور رہبان ان سے کہتے کہ تم خدا کو چھوڑ کر ہماری عبادت کرو تو وہ ان کی اطاعت نہ کرتے۔ مگر جب انہوں نے خدا کے حلال کیے ہوئے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حلال قرار دیا تو وہ اس باب میں ان کی اطاعت پر راضی ہو گئے۔ یہی چیز ربوبیت ہے۔ وکیع نے سفیان اور اعمش سے اور انہوں نے حبیب بن ابی ثابت سے اور انہوں نے ابو البختری سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ سے اس آیت پر سوال کیا گیا کہ نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کی عبادت کب کرتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر ان کے حلال کو حلال اور ان کے حرام کو حرام ضرور مانتے تھے۔

[۱] یہ حدیث مسند امام احمد اور ترمذی میں تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

"پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِىْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ، اس طرح جب باپ دادا کی تقلید نے ان کو ہدایت قبول کرنے سے روک دیا تو انہوں نے رسولوں سے صاف کہدیا کہ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ (ہم اس پیغام کو نہیں مانتے جسے تم لائے ہو) ایسے ہی لوگوں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ (البقرہ: ۲۰)

وہ ایسا دن ہوگا کہ جن کی پیروی کی گئی ہے وہ اپنے پیروؤں سے براءت ظاہر کریں گے اور اپنی آنکھوں سے عذاب دیکھ لیں گے اور ان کے درمیان سب تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور پیروی کرنے والے کہیں گے کہ کاش ہم کو ایک موقع اور ملتا تو ہم ان سے اُسی طرح تبرّی کرتے جس طرح انہوں نے ہم سے تبرّی کی ہے۔ یوں اللہ ان کے اعمال ان کے سامنے لائیگا اور وہ پیکر حسرت بن جائیں گے۔

پھر اللہ تعالیٰ اہل کفر کی مذمت کرتے ہوئے فرماتا ہے۔

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِىْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ۔ (انبیاء: ۵)

ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ کیسی مورتیں ہیں جن کے تم گرویدہ ہو رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے پایا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :۔

وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا (الاحزاب)

اور انہوں نے کہا کہ خدایا ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی تھی اور انہی نے ہم کو گمراہ کیا

اس قسم کی آیات قرآن میں بہت ہیں جن میں باپ دادا اور سرداران قوم کی تقلید کو برا کہا گیا ہے۔ علماء تقلید کے ابطال میں انہی آیات سے استدلال کرتے ہیں اور اس امر کا لحاظ نہیں کرتے کہ یہ آیات جن لوگوں کے حق میں آئی ہیں وہ کافر تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دراصل جو چیز مذمت کے قابل ہے اور جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ انسان خدا کی دی ہوئی روشنی سے آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے ہو لے اور کچھ نہ دیکھے کہ وہ کدھر جا رہا ہے حتّٰی کہ اگر اس کا پیشوا کفر کرے تو یہ بھی کافر ہو جائے، اور اگر وہ گناہ کرے تو یہ بھی گناہ کرنے لگے اور اگر وہ کسی مسئلہ میں خطا کرے تو یہ بھی اس خطا میں گرفتار ہو جائے۔ اسی مذہبی تقلید کے اعتبار سے کفار کی تقلید کرنے والوں اور اہل ایمان کی تقلید کرنے والوں کے درمیان مشابہت واقع ہوتی ہے۔ دونوں میں مدارج کا فرق ضرور ہے، ایک زیادہ بڑی ہے اور دوسری کم، لیکن نوعیت دونوں کی ایک ہی ہے، اور دونوں جگہ یہی چیز بنائے فساد ہے۔ کفار جو کفر کے خطرے میں مبتلا ہوئے تو اسی وجہ سے ہوئے کہ انہوں نے خدا کی ہدایت سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو انسانوں کے حوالے کر دیا اور آنکھیں بند کر کے اُن کے پیچھے چلنے لگے نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے رہبر جوں جوں خدائی ہدایت سے ہٹتے گئے، یہ بھی ان کے ساتھ ساتھ ہٹتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے کفر کی حد میں قدم رکھا تو یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے اُسی حد میں پہنچ گئے۔ پس جو لوگ خود آنکھیں کھول کر خدائی ہدایت کو نہیں دیکھتے، اور بالکل دوسرے انسانوں پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ وہ دراصل اپنے آپ کو اسی خطرے میں ڈالتے ہیں جس میں پچھلی اُمتیں

مبتلا ہو کر گمراہ ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ اِذْ هَدٰهُمْ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمْ مَا يَتَّقُوْنَ "اللہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد کبھی گمراہی میں نہیں ڈالتا جب تک کہ انہیں واضح طور پر یہ نہ بتا دے کہ انہیں کس چیز سے بچنا چاہیے"۔

آگے چل کر علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں:۔

"جب مذکورہ بالا دلائل سے تقلید کا بطلان واضح ہو گیا تو لازم آیا کہ اُن اصول کو تسلیم کیا جائے جنہیں تسلیم کرنا واجب ہے۔ وہ اصول کیا ہیں؟ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت، اور جو کچھ ان دونوں سے استدلال کر کے ماخوذ ہو"۔

اس کے بعد علامہ نے وہ حدیث نقل کی ہے جسے کثیر بن عبد اللہ بن عمرو بن عوف نے اپنے باپ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے:۔

انی لا اخاف علی امتی من بعدی الا اعمال ثلثة۔ قالوا وما ھی یا رسول اللہ۔ قال اخاف علیھم من زلة العالم ومن حکم جائر ومن ھوی متبع۔	میں اپنے بعد اپنی امت کے لیے تین چیزوں سے ڈرتا ہوں وہ بدترین ہی اعمال ہیں لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ آپ نے فرمایا میں ڈرتا ہوں عالم کی لغزش سے اور ظالم کے حکم سے اور ہوائے نفس کی پیروی سے۔

اور اسی اسناد سے یہ روایت بھی منقول ہے کہ حضور نے فرمایا:۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنة رسولہ۔	میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں ایسی چھوڑی ہیں کہ اگر تم ان کو تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت

مصنفین اہل السنتہ نے عموماً ابطال تقلید کے ساتھ عالم کی لغزش کا ضرور ذکر کیا ہے کیونکہ تقلید کا فساد اسی سے واضح ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ رسول کے سوا کوئی انسان بھی معصوم نہیں خواہ وہ کتنے ہی بڑے درجہ کا انسان ہو۔ اور جب وہ معصوم نہیں تو ضرور ہے کہ اس سے کہیں نہ کہیں لغزش سرزد ہو۔ اسی بنا پر یہ جائز نہیں کہ اس کے قول کو بلا دلیل و حجت تسلیم کیا جائے اور اس کی بات کو وہ درجہ دیا جائے جو معصوم کی بات کو دینا چاہیے۔ یہی چیز ہے جس کی مذمت تمام علماء نے کی ہے اور اسے حرام ٹھیرایا ہے اور اس کے مرتکبین کی مذمت کی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ مقلدین جن فتنوں اور بلاؤں میں مبتلا ہوتے ہیں ان کی جڑ یہی ہے۔ وہ ایک عالم کی تقلید اُن چیزوں میں بھی کرتے ہیں جن میں اس سے لغزش ہوی ہے اور اُن چیزوں میں بھی جن میں اس سے لغزش نہیں ہوی۔ صحیح اور غلط کے درمیان وہ تمیز کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے، بلکہ تمیز کرنے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے ..... نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے دین کو خطا کے ساتھ لیتے ہیں، اور ناگزیر طور پر اُسی غلطی میں مبتلا ہوجاتے ہیں جس میں یہود و نصاریٰ مبتلا ہوے، یعنی اللہ کے حلال کیے ہوے کو حرام اور اس کے حرام ٹھیرائے ہوے کو حلال کرلینا اور اُن چیزوں کو مشروع بنالینا جن کو خدا نے مشروع نہیں کیا۔ جب کوئی شخص کسی غیر معصوم انسان کی تقلید اپنے اوپر لازم کرے گا اور بلا دلیل و حجت اس کی پیروی کرے گا تو لامحالہ یہ صورت ضرور پیش آئے گی اور کوئی چیز اس کو پیش آنے سے نہ روک سکیگی۔

بیہقی وغیرہ نے انہی کثیر بن عبداللہ بن عمرو سے مرفوعاً یہ روایت نقل کی ہے کہ اتقوا زلۃ العالم و انتظروا فیئتہ۔ (عالم کی لغزش سے بچو اور غلطی سے اس کے رجوع کا انتظار کرو) نیز بیہقی ہی نے دوسری حدیث مسعود بن سعد سے نقل کی ہے جسے یزید بن ابی زیاد نے مجاہد سے اور انہوں نے ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِنَّ اشد ما اتخوف علیٰ امتی ثلاثٌ میں اپنی امت کے حق میں سب سے زیادہ جن چیزوں سے

زلة عالم وجدال منافق بالقرآن ودنیا تقطع اعناقکم۔

ڈرتا ہوں وہ تین ہیں۔ عالم کی لغزش اور منافق کا قرآن سے استدلال اور وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ عالم کی لغزش سے خوف کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگ اس لغزش میں اس کی تقلید کرنے لگیں گے اور وہ بہت سے لوگوں کو غلطی میں مبتلا کر دے گی۔ اگر تقلید کا خوف نہ ہوتا تو کسی عالم کی لغزش میں امت کے لیے خوف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

شعبی کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا "دنیا کو بگاڑنے والی تین چیزیں ہیں۔ گمراہ کرنے والے سردار۔ اور منافق کا قرآن سے استدلال۔ اور عالم کی لغزش۔

بیہقی نے ایک اور حدیث نقل کی ہے جس کو حماد بن زید نے مثنیٰ بن سعید سے اور انہوں نے ابو العالیہ سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا پیروی کرنے والوں کے لیے عالم کی لغزشوں میں بڑا خطرہ ہے پوچھا گیا وہ کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ عالم ایک بات اپنی رائے سے بیان کر دیتا ہے پھر اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد پہنچ جاتا ہے جس کی بنا پر وہ اپنی پہلی رائے سے رجوع کر لیتا ہے۔ مگر پیروی کرنے والا اس کے پہلے قول ہی کا اتباع کیے چلا جاتا ہے۔

تمیم الداری کا قول ہے کہ عالم کی لغزش سے بچو۔ پوچھا گیا اس میں ڈرنے کی کیا چیز ہے؟ انہوں نے کہا یہ کہ عالم لغزش کرے اور لوگ اس کے پیچھے چل پڑیں اس لیے کہ بسا اوقات عالم کو خود اپنی غلطی پر تنبہ ہو جاتا ہے اور وہ اس سے رجوع کر لیتا ہے مگر لوگ اسی غلطی پر قائم رہتے ہیں۔

شعبہ نے عمرو بن مرہ سے اور انہوں نے عبداللہ بن سلمہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت معاذ بن جبل نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا "اے قوم عرب! تم تین خرابیوں کا کیا علاج کرو گے، ایک وہ دنیا جو تمہاری گردنیں کاٹنے لگے، دوسرے منافق کا قرآن سے استدلال

تیسرے عالم کی لغزش؟" لوگ خاموش رہے۔ حضرت معاذ نے پھر فرمایا عالم کی لغزش کا علاج یہ ہے کہ کوئی عالم اگر ہدایت پر بھی ہو تب بھی اندھے بن کر اپنے دین کو بالکل اس کے ہاتھ میں نہ دے دو اور اگر وہ غلطی میں پڑا ہوا ہو تو اس کے مقابلہ میں تحمل کو ہاتھ سے نہ دو کیونکہ مومن ایک دفعہ فتنہ میں پڑجاتا ہے، پھر اس سے توجہ کرلیتا ہے۔ رہا قرآن تو وہ ایک منارہ ہے جیسے راستوں میں منارے ہوتے ہیں کہ وہ کسی سے مخفی نہیں ہوتے پس جو بات تم کو قرآن سے معلوم ہو جائے اس کو کسی سے نہ پوچھو اور جس میں تمہیں شک ہو اسے جاننے والے سے پوچھ لو۔ رہی دنیا تو فلاح وہی پاسکتا ہے جسے خدا کی طرف سے قناعت کی توفیق مل جائے۔ ورنہ حریص کی پیاس تو کبھی دنیا سے بجھ نہیں سکتی

اسی کے قریب قریب حضرت سلمان فارسی کا قول بھی ہے جسے ابوالبختری نے روایت کیا ہے۔ اور ابن عبدالبرؒ کا بیان ہے کہ حکما نے عالم کی لغزش کو کشتی کے ٹوٹنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس لیے کہ کشتی جب ڈوبتی ہے تو اس کے ساتھ ایک خلقت کی خلقت ڈوب جاتی ہے۔ اس قول کو نقل کرنے کے بعد ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ جب یہ صحیح اور ثابت ہے کہ عالم سے خطا اور لغزش سرزد ہوتی ہے تو معلوم ہوا کہ کسی شخص کے لیے کسی انسان کے قول پر فتویٰ دینا یا اس کی رائے پر چلنا جائز نہیں تاوقتیکہ اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ اس کا قول کس حجت پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے بزرگ کا قول ہے کہ جس طرح قاضی تین قسم کے ہیں اور ان میں سے دو ناری اور ایک جنتی ہے، اسی طرح مفتی بھی تین قسم کے ہیں اور ان میں سے دو ناری ہیں اور صرف ایک جنتی ہے۔ قاضی اور مفتی میں فرق اتنا ہے کہ قاضی پر اس کے فیصلے کا الزام آتا ہے اور مفتی پر نہیں آتا۔

ابو ذرعہ عبدالرحمن بن عمر بصری نے ابومسہر سے اور انہوں نے سعید بن عبدالعزیز سے اور انہوں نے اسماعیل بن عبیداللہ سے اور انہوں نے سائب بن یزید بن اخت نمر سے روایت کیا ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تم لوگوں کی باتیں بہت بڑی اور تمہارا کلام

بہت خراب ہے تم آپس میں باتیں کرتے ہو تو کہتے ہو فلاں کا قول یہ ہے اور فلاں یہ کہتا ہے مگر کتاب اللہ کا ذکر کہیں نہیں آتا تم میں سے جو کھڑا ہونا چاہتا ہے وہ کتاب اللہ کو لیکر اٹھے ورنہ بیٹھا رہے"۔ دیکھو! حضرت عمر یہ بات اس زمانہ کے لوگوں سے کہہ رہے ہیں جو تاریخ میں بہترین دور سمجھا جاتا ہے۔ اگر آج وہ دیکھتے کہ لوگ کس طرح کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر عمرو زید کی باتیں کرتے ہیں تو نہ معلوم وہ کیا فرماتے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کمیل بن زیاد النخعی سے جو کچھ فرمایا تھا وہ بھی قابل غور ہے۔ یہ حدیث اہل علم میں اس قدر مشہور ہے کہ اس کی اسناد نقل کرنے کی بھی ضرورت نہیں آپ نے فرمایا اے کمیل! یہ دل گویا ظروف ہیں، اور ان میں بہترین ظرف وہ ہے جس میں بھلائی کے لیے زیادہ گنجائش ہو۔ لوگ تین طرح کے ہیں۔ ایک عالم ربانی دوسرا وہ متعلم جو نجات کے راستہ پر چلتا ہو تیسرے حشرات الارض جو ہر شور مچانے والے کے پیچھے چل پڑیں اور ہر بلند بانگ کے گرد جمع ہو جائیں۔ وہ نہ کبھی نور علم سے روشنی حاصل کرتے ہیں اور نہ کبھی کسی مضبوط بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔ پھر اپنے سینہ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا آہ! اس میں جو علم ہے کاش مجھے اس کے لینے والے ملتے۔ مگر افسوس کہ مجھے یا تو وہ لوگ ملتے ہیں جو سمجھ تو رکھتے ہیں لیکن دین کو دنیا کے لیے آلہ بنانے والے اور اللہ کی کتاب پر حجتوں سے دست درازی کرنے والے اور اللہ کی نعمتوں کو اس کی نافرمانی میں استعمال کرنے والے ہیں۔ یا پھر ایسے لوگ ملتے ہیں۔ جو حق کے پرستار تو ہیں مگر بصیرت نہیں رکھتے۔ شک پہلا موقع پاتے ہی ان کے دلوں میں گھس جاتا ہے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ حق کہاں ہے۔ جب بولتے ہیں تو غلط بولتے ہیں۔ اور جب غلطی کرتے ہیں تو اپنی غلطی پر متنبہ نہیں ہوتے۔ وہ ان چیزوں میں مشغول رہتے ہیں جن کی حقیقت کو وہ نہیں جانتے۔ ایسے لوگ ایک فتنہ ہیں۔ سب سے بڑی بھلائی یہ ہے کہ اللہ کسی کو اپنے دین کی سمجھ عطا کرے اور انسان کے لیے بدترین جہالت یہ ہے کہ وہ اپنے دین کو نہ سمجھے۔

ابوالبختری حضرت علی سے روایت کرتے ہیں کہ خبردار لوگوں کے طریقہ کو اپنے لیے سنت نہ بناؤ۔ ایک شخص اہل جنت کا سا عمل کرتا ہے پھر وہ یکایک پلٹ جاتا ہے اور اہل دوزخ کے سے اعمال کرنے لگتا ہے اور اسی حال پر مرجاتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اہل دوزخ کا سا عمل کرتا ہے، پھر اللہ اس کا دل پھیر دیتا ہے اور وہ اہل جنت کے سے عمل کرنے لگتا ہے، یہاں تک کہ اسی راہ میں اسے موت آتی ہے۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص اپنا دین کسی دوسرے شخص کے قبضہ میں نہ دے دے کہ اگر وہ مومن ہوا تو یہ بھی مومن ہوا اور اگر وہ کافر ہوا تو یہ بھی کافر ہوگیا۔ غلطی میں کسی کی بھی پیروی نہ کرنی چاہیے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے کہ آپ نے فرمایا اہل علم گذر جائیں گے۔ پھر لوگ جاہلوں کو اپنا سردار بنالیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دینے لگیں گے۔ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کردیں گے۔

یونس بن عبدالاعلیٰ اپنے استاد سفیان بن عیینہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ربیعہ سر جھکائے ہوئے رو رہے تھے۔ پوچھا گیا کہ رونے کا سبب کیا ہے۔ فرمایا ظاہر میں ریا ہے۔ اور باطن میں شہوات ہیں علماء کے سامنے لوگوں کا حال بچوں کا سا ہوگیا ہے جس چیز کو وہ حرام ٹھیراتے ہیں وہ حرام ہوجاتی ہے اور جسے مشروع قرار دیتے ہیں وہ مشروع بن جاتی ہے۔

عبداللہ بن المعتمر کہتے ہیں کہ حیوان منقاد اور انسان مقلد میں کوئی فرق نہیں۔ پھر وہ ابن وہب سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں جس کو انہوں نے سعید بن ابی ایوب سے اور انہوں نے بکر بن عمر سے اور انہوں نے عمرو بن ابی نعیمہ سے اور انہوں نے مسلم بن یسار سے اور انہوں نے ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کسی نے میری طرف سے ایسی بات بیان کی جو میں نے نہیں کہی ہے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں ڈھونڈھ لے۔ اور اگر کوئی اپنے بھائی سے مشورہ لے اور وہ اس کو بے

بوجھے رائے دے دے تو گویا اس نے اپنے بھائی سے خیانت کی۔ اور اگر کوئی بغیر ثبوت کے فتوی دیدے تو جو لوگ اس کے فتوے سے غلطی سے مبتلا ہوں گے ان کا وبال اسی فتوی دینے والے پر ہوگا۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ تقلیداً فتوی دینا حرام ہے، اس لیے کہ اس قسم کا فتوی بے ثبوت ہی ہے۔ ثبوت کے معنی بالاتفاق یہ قرار دیئے گئے ہیں کہ ایسی حجت جس سے حکم ثابت ہوتا ہو۔ پس جب کہ انسان کا قول حجت ہی نہیں ہے تو اس کی بنیاد پر جو فتوی ہوگا وہ بے ثبوت نہیں تو اور کیا ہوا۔

ابو عبداللہ بن خواز منداد البصری المالکی نے لکھا ہے کہ اصطلاح شرعی میں تقلید کے معنی ہیں کسی شخص کے قول کی طرف رجوع کرنا بغیر اس کے کہ اس کی حجت معلوم کی جائے۔ یہ شریعت میں ممنوع ہے۔ اور اتباع کے معنی ہیں کسی شخص کی حجت کو قبول کرکے اس کے قول کی پیروی کرنا۔ یہ فعل شرعاً جائز ہے۔ ایک دوسری جگہ یہی بزرگ لکھتے ہیں کہ جب تم نے کسی شخص کے قول کی پیروی اختیار کی بغیر اس کے کہ کوئی دلیل ایسی ہو جس کی بنا پر تم اس کی بات مان رہے ہو تو تم اس کے مقلد ہوئے اور اللہ کے دین میں ایسی تقلید درست نہیں۔ اور اگر تم کسی شخص کی دلیل سے مطمئن ہو کر اس کے قول کی پیروی کرو تو یہ اتباع ہے، اور اتباع شریعت میں درست ہے۔

محمد بن حارث نے سحنون بن سعید کے حالات میں خود سحنون سے یہ روایت نقل کی ہے کہ امام مالک اور عبدالعزیز بن ابی سلمہ اور محمد بن ابراہیم بن دینار وغیرہم اکثر ابن ہرمز کے پاس جایا کرتے تھے۔ ابن ہرمز کا طریقہ یہ تھا کہ جب مالک اور عبدالعزیز کچھ پوچھتے تو وہ اس کا جواب دیدیتے اور جب ابن دینار اور ان کے ساتھی کچھ پوچھتے تو وہ جواب نہ دیتے۔ ایک روز ابن دینار نے ان سے شکایت کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ بھتیجے میں بڈھا آدمی ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ جس طرح میرے جسم میں انحطاط پیدا ہو گیا ہے ممکن ہے کہ میری عقل میں بھی ہو گیا ہو۔ مالک اور عبدالعزیز عالم اور فقیہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ سے جو بات سنیں گے وہ اگر حق ہوگی تو قبول کریں گے اور اگر غلط ہوگی تو رد کردیں گے۔

تم لوگوں سے مجھے اندیشہ ہے کہ جو کچھ میں کہوں گا اسے مانتے چلے جاؤ گے اس واقعہ کو نقل کر کے ابن حارث لکھتے ہیں کہ یہ ہے اہل حق کا طریقہ۔ نہ یہ کہ انسان جو کچھ ہذیان بکے اسے چاہے کہ لوگ اس طرح قبول کریں جیسے قرآن نازل ہو رہا ہے۔

تمام بزرگان سلف اور ائمۂ اربعہ کا یہی طریقہ تھا کہ وہ لوگوں کو خود اپنی تقلید سے منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہماری بات کو دلیل و حجت کے بغیر تسلیم نہ کرو۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ جو شخص علم کو حجت کے بغیر لیتا ہے اس کی مثال رات کے اندھیرے میں لکڑیاں چننے والے کی سی ہے کہ وہ لکڑیوں کو بغیر دیکھے بھالے اٹھاتا جاتا ہے اور اسے خبر نہیں کہ ان میں کہاں کوئی سانپ چھپا ہوا ہے جو اسے ڈس لے گا۔

ابوداؤد نے لکھا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ امام احمد سے کہا اوزاعی تو مالک سے مقدم ہیں انہوں نے جواب دیا کہ "تم اپنے دین کو ان میں سے کسی کے بھی حوالہ نہ کرو۔ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے ثابت ہو جائے اس کو قبول کر لو۔ ان کے بعد تابعین کے اقوال میں تمہیں اختیار ہے جسے چاہو قبول کرو اور جسے چاہو رد کر دو۔

امام احمد نے تقلید اور اتباع میں فرق کیا ہے۔ ابوداؤد ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ اتباع یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب سے جو کچھ ثابت ہو اس کی پیروی کی جائے۔ بعد کے کسی شخص کا قول حجت نہیں ہے۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ تم نہ میری تقلید کرو نہ مالک کی نہ ثوری کی نہ اوزاعی کی بلکہ جہاں سے ہم نے لیا ہے وہیں سے تم بھی لو۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی ناسمجھی کی دلیل ہے کہ وہ اپنے دین کو اشخاص کے ہاتھ میں دیدے۔

بشر بن ولید نے امام ابویوسف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ کسی شخص کے لیے ہمارے قول کا اتباع جائز نہیں تا وقتیکہ وہ یہ نہ جان لے کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں کس بنا پر کہہ رہے ہیں۔

رسائل و مسائل

نماز اور خطبہ جمعہ کی زبان

(۲)

۲۔ خطبہ جمعہ کی زبان | اب ہم سوال کے دوسرے حصہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو خطبہ جمعہ کی زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس مسئلہ میں یہ ایک عام غلطی ہے کہ خطبہ کی زبان کے سوال کو نماز کی زبان کے سوال سے مربوط کر دیا جاتا ہے اور اس سے بڑا خلط مبحث واقع ہوتا ہے۔ لہٰذا پہلے ہم اسی امر کی توضیح کریں گے کہ نماز اور خطبہ کی حیثیتوں میں کیا فرق ہے۔

خطبہ جزو صلاۃ نہیں | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خطبہ نماز جمعہ کا جز ہے۔ اس کی دلیل وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ظہر کی چار رکعتوں میں سے دو رکعتیں خطبہ ہی کے لیے کم کی گئی ہیں، جیسا کہ احادیث میں حضرت عمر اور حضرت عائشہ سے منقول ہے کہ انما قصرت الجمعۃ لاجل الخطبۃ۔ اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ خطبہ جو نکہ نماز کی دو رکعتوں کا قائم مقام ہے لہٰذا اس کی حیثیت بھی وہی ہے جو نماز کی ہے۔ اور جب نماز غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں تو خطبہ بھی غیر عربی میں پڑھنا درست نہیں۔

لیکن یہ محض ایک سطحی رائے ہے۔ دونوں کے احکام کی تفصیلات پر نظر ڈالنے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ جو امور نماز کے لیے شرط ہیں وہ خطبہ کے لیے شرط نہیں ہیں۔ نماز کے لیے طہارت شرط ہے، مگر خطبہ کے لیے شرط نہیں، حتیٰ کہ اگر سہواً حالت جنابت میں بھی خطبہ پڑھ دیا ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں۔ نماز کے لیے قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ مگر خطبہ جمعہ کے لیے نہ صرف یہ کہ استقبال قبلہ ضروری نہیں، بلکہ قبلہ کی طرف پشت کر کے مقتدیوں کی طرف رخ کرنے کا حکم ہے۔ نماز میں گفتگو کرنے سے فساد واقع ہو جاتا ہے۔ مگر خطبہ میں کلام

کیا جا سکتا ہے اور خود نبی اکرم اور صحابۂ کرام سے یہ فعل ثابت ہے جیسا کہ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔ نماز کے لیے وقت بھی شروط ہے لیکن خطبہ اگر وقت سے پہلے شروع کر دیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ نماز جمعہ میں حنفیہ کے نزدیک کم از کم تین آدمیوں کا ہونا ضروری ہے لیکن خطبہ میں اگر امام کے سوا صرف ایک آدمی ہو تب بھی کافی ہے نماز جمعہ اگر فاسد ہو جائے تو اس کا اعادہ کیا جائے گا لیکن خطبہ کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ یہ سب امور اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ خطبہ نماز جمعہ کا جزو نہیں ہے چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں۔

قال بعض مشائخنا الخطبة تقوم مقام ركعتين ولهذا لا تجوز الا بعد دخول الوقت والاصح انها لا تقوم مقام شطر الصلوٰة۔ (المبسوط ۸ ۔ کتاب الجمعہ)

ہمارے بعض مشائخ کہتے ہیں کہ خطبہ چونکہ دو رکعتوں کا قائم مقام ہے اس لیے ظہر کا وقت شروع ہونے سے پہلے خطبہ پڑھنا جائز نہیں۔ مگر صحیح یہ ہے کہ خطبہ کی حیثیت نماز کے ایک حصہ کی نہیں ہے۔

اور شرح العنایہ علی الهدایہ میں ہے:-

انها ليست بركن لان ركن الشيء ما يقوم به ذالك الشيء وصلاة الجمعة لا تقوم بالخطبة وانما تقوم باركانها فكانت شرطاً۔

خطبہ رکن نماز نہیں ہے کیونکہ کسی چیز کا رکن تو وہ ہوتا ہے جس سے وہ چیز قائم ہوتی ہو اور نماز جمعہ خطبہ سے قائم نہیں ہوتی بلکہ اپنے ارکان سے ہوتی ہے لہٰذا خطبہ رکن نہیں بلکہ شرط ہے۔

نماز اور خطبہ کے مقاصد کا فرق اس میں شک نہیں کہ خطبہ بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے لیکن دونوں کے مقاصد مختلف ہیں۔ نماز سے جو کچھ مقصود ہے وہ بغیر اس کے بھی حاصل ہو سکتا ہے کہ انسان اُن عبارات کو سمجھے جن کو وہ نماز میں پڑھتا ہے، اس لیے کہ اُس کا خدا کی فرض کی ہوئی عبادت کو فرض سمجھنا اور نماز کا وقت آنے پر ادائے فرض کے لیے اٹھنا، اور اس کا اہتمام کرنا، پھر پوری شرائط اور تمام ارکان

کے ساتھ نماز کو اس طرح ادا کرنا کہ گویا اسے اس امر کا شعور ہے کہ خدا اس کی خفی سے خفی باتوں کو سن رہا ہے۔ اور یہ کہ اگر وہ نماز میں کوئی چیز بھی کم کرے گا تو خدا کو اس کا علم ہو جائے گا، پھر اس کا یہ سمجھنا کہ یہ رکوع وسجود اور قیام وقعود جو کچھ بھی میں کر رہا ہوں صرف خدا کے لیے ہے، اور خدا کے سوا میں کسی کا عبادت گذار نہیں ہوں، یہ سب امور اس مقصد کی تحصیل کے لیے بالکل کافی ہیں جس کے لیے نماز فرض کی گئی ہے۔ لیکن خطبہ جس غرض کے لیے مقرر کیا گیا ہے وہ بغیر اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ سامعین اس کو سمجھیں، اس لیے کہ خطبہ کا مقصد محض خدا کی یاد اور ذات حق کی طرف رجوع اور خشیت اور انابت ہی نہیں ہے، بلکہ احکام دین کی تبلیغ وتعلیم اور وعظ وتذکیر بھی ہے۔ اور یہ مقصد حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ لوگ ان احکام اور مواعظ کو سمجھیں نہیں جو خطبہ میں بیان کئے جاتے ہیں۔

خطبہ کا مقصد بعض لوگ اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ خطبہ کا مقصد تبلیغ احکام اور وعظ وتذکیر ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خطبہ کو ذکر اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ (فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ) لہٰذا خطبہ بھی ویسی ہی ایک عبادت ہے جیسی کہ نماز ہے اور اس کے لیے بھی یہ ضروری نہیں کہ لوگ اس کو سمجھیں اس کی تائید میں وہ امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کرتے ہیں کہ خطبہ کی شرط پوری کرنے کے لیے صرف اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کافی ہے، اور عرف عام میں جس چیز کو خطبہ سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ نماز جمعہ کے لیے شرط نہیں ہے۔ نیز وہ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ جب آپ خلیفہ ہوئے اور خطبہ دینے کے لیے اٹھے تو آپ پر مجمع کا رعب طاری ہو گیا۔ اور آپ صرف الحمد للہ کہہ کر بیٹھ گئے اور صحابہ کرام کی جماعت نے اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

لیکن یہ استدلال متعدد وجوہ سے غلط ہے۔

اولاً یہ یقینی نہیں کہ آیۂ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ میں ذکر اللہ سے مراد خطبۂ جمعہ ہے ذکر سے مراد نماز بھی ہو سکتی ہے، بلکہ قرآن میں اکثر اس لفظ سے نماز ہی مراد لی گئی ہے مفسرین اور اہل لغت

میں یہ امر مختلف فیہ ہے کہ آیا ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے یا صرف نماز یا نماز اور خطبہ دونوں[1]۔ مگر آیت کے سیاق پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ذکر کو نماز کے معنی میں لینا زیادہ درست ہے، کیونکہ پہلے اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فرمایا پھر اس کی جزا یہ بیان کی کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل میں ذکر سے مراد نماز ہی ہے، اور خطبہ محض ضمناً ذکر میں شامل ہو جاتا ہے۔ ورنہ اگر ذکر سے مراد صرف خطبہ ہوتا تو اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَالصَّلٰوۃِ فرمایا جاتا۔

ثانیاً اگر ذکر اللہ کو نماز کے معنی میں نہ لیا جائے بلکہ یاد خدا کے معنی میں لیا جائے تو یہ کس دلیل سے ثابت ہوا کہ خدا کی یاد صرف عربی زبان ہی میں ہونی چاہیے؟ اللہ کے ذکر کو عربی زبان تک محدود کرنا تو عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ قرآن اور حدیث میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ خدا کو یاد کرنا ہو تو صرف عربی میں کرو۔ چنانچہ اسی بنا پر امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ الذکر المفید للتعظیم یحصل بغدای بزرك مست کما یحصل بقولہ اللہ اکبر۔ اور امام محمد ان کی تائید میں کہتے ہیں۔ الذکر یحصل بکل لسانٍ۔

ثالثاً خطبہ کی شرط پوری کرنے کے لیے اگر حنفیہ نے محض حمد و ثنا کو کافی سمجھا ہے تو اس کے معنی یہ کب ہیں کہ خطبہ کا جو مقصد ہے وہ بس حمد و ثنا ہی سے حاصل ہو جاتا ہے اور اس کے سوا دوسری چیزیں محض زوائد ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں[2]۔ حنفیہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ نماز جمعہ کے لیے جماعت کی شرط صرف

[1] علامہ ابن ہمام کہتے ہیں: فاسعوا الی ذکر اللہ۔ فالظاہر ان المراد بالذکر الصلوٰۃ ویجوز کون المراد بہ الخطبۃ (فتح القدیر)۔ صاحب روح المعانی لکھتے ہیں والمراد بذکر اللہ الخطبۃ والصلوٰۃ ویستظہر ان المراد بہ الصلوٰۃ وجوز کون المراد بہ الخطبۃ۔ سعید بن المسیب کے نزدیک ذکر سے مراد موعظۃ الامام ہے (احکام القرآن للجصاص)۔ علامہ ابوبکر جصاص کی رائے یہ ہے کہ ذکر سے مراد صرف خطبہ ہے۔ ویدل علی ان المراد بالذکر ھٰھنا ھو الخطبۃ لان الخطبۃ ھی التی تلی النداء وقد امر بالسعی الیہ فدل علی ان المراد الخطبۃ۔

[2] حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے واقعے سے جو استدلال کیا جاتا ہے وہ درست نہیں۔ اول تو اس واقعہ میں خود اس کی تصریح ہے کہ حضرت عثمانؓ نے قصداً ایسا نہیں کیا تھا، بلکہ مجمع سے مرعوب ہو جانے کی وجہ سے آپ کی قوت گویائی جواب

تین آدمیوں سے پوری ہوجاتی ہے۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ جمعہ کی اقامت سے جو مقصد ہے وہ بس اسی مختصر سی جماعت سے حاصل ہوجاتا ہے؟ اور جماعت کثیرہ کا فراہم ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

رابعاً خود اکابر حنفیہ ہی نے یہ تصریح کی ہے کہ خطبہ سے مقصود ذکر اور موعظت ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے ولو خطب قاعداً او علیٰ غیر طہارۃ جاز لحصول المقصود اور علامہ ابن ہمام مقصود کی شرح کرتے ہیں وھو الذکر والموعظۃ۔ حنفیہ ہی پر کیا موقوف ہے متقدمین سب کے سب خطبہ کا مقصد یہی سمجھتے تھے اور اسی بنا پر ان کی زبان میں اکثر خطبہ کے لیے "موعظۃ الامام" کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ علامہ ابن حجر فتح الباری میں ایک حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ومن حکمۃ استقبالھم للامام التھیؤ لسماع کلامہ وسلوک الادب معہ فی استماع کلامہ فاذا استقبلہ بوجھہ واقبل علیہ بجسدہ وبقلبہ وحضور ذھنہ کان ادعیٰ لتفھیم موعظتہ وموافقتہ فیما شرع لہ القیام لاجلہ۔ (ج ۲ ص ۲۰۳)

حاضرین کو امام کی طرف رخ کرکے بیٹھنے کی جو ہدایت کی گئی اس کی حکمت یہ ہے کہ وہ اس کے کلام کو سننے کے لیے تیار ہوں اور کلام کی سماعت میں اس کے ساتھ ادب کو ملحوظ رکھیں جب سننے والا اپنا چہرہ اس کی طرف رکھے گا اور اپنے جسم و قلب کے ساتھ اس کی جانب متوجہ ہوگا اور حضور ذہن کے ساتھ سنے گا تو امام کی موعظت اچھی طرح اس کی سمجھ میں آئے گی

اور یہ اس مقصد کے لیے مددگار ہوگا جس کے لیے امام کو کھڑے ہوکر خطبہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

خامساً یہ امر غور طلب ہے کہ اگر خطبہ کا طریقہ جاری کرنے سے شارع کا مقصد محض اللہ کا ذکر ہی کرنا ہوتا تو کیا اس کے لیے نماز کافی نہ تھی، حالانکہ وہ اس مقصد کو بدرجۂ اتم پورا کرتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے

لہ تکملہ حاشیہ ص ۶۶ ـــ دے گئی تھی اس لیے آپ نے مجبوراً خطبہ مختصر کردیا۔ دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ آنجناب نے صرف حمد و ثنا پر اکتفا کی تھی۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ جب آپ نے دیکھا کہ قوت گویائی جواب دے رہی ہے تو صرف اتنا کہہ کر بیٹھ گئے کہ ان ابابکر وعمر کانا یعدان لھذا المقام مقالا وانتم الی امام فعال احوج منکم الی امام قوال وستاتیکم الخطب بعد واستغفر اللہ لی ولکم۔

کہ نماز جیسی کامل و اکمل عبادت کو مختصر کر کے اس کے وقت کا ایک حصہ خطبہ کو دیا گیا اور اس کو جمعہ کی شرائط میں داخل کیا گیا؟

سادساً نماز جمعہ کے لیے خطبہ کا اشتراط جس چیز سے فقہاء نے نکالا ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا متواتر عمل ہے چونکہ آنحضرت اور آپ کے خلفاء اور صحابہ کرام نے کبھی جمعہ بغیر خطبہ کے نہیں پڑھا اس لیے یہ حکم مستنبط کیا گیا کہ جمعہ کے لیے خطبہ شرط ہے۔ بالکل اسی طرح آپ کے اور صحابہ کرام کے متواتر عمل سے ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ محض حمد و ثنا ہی پر مشتمل نہ ہوتا تھا، بلکہ اس میں شریعت کے احکام بیان ہوتے تھے، اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لیے نصیحتیں ہوتی تھیں، قومی اور شخصی معاملات پر توجہ کی جاتی تھی، حتیٰ کہ عین خطبہ ہی کی حالت میں امام کسی خاص شخص کی کوئی غلطی دیکھتا تو اس کی اصلاح کرتا، کسی مصیبت زدہ کو دیکھتا تو اس کی مدد کے لیے لوگوں کو توجہ دلاتا، عوام میں سے کسی کو کوئی شکایت ہوتی تو وہ امام کے سامنے اس کو پیش کرتا اور امام اس کی طرف متوجہ ہوتا جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین نے کوئی جمعہ بغیر خطبہ کے نہیں پڑھا اسی طرح آپ نے اور آپ کے صحابہ نے کوئی خطبہ ایسا بھی نہیں پڑھا جو مذکورۂ بالا خصوصیات سے عاری ہو۔

چند خطب ماثورہ اس مطلب کی توضیح کے لیے ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چند خطبات یہاں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ شارع کی نگاہ میں خطبۂ جمعہ کی دراصل کیا حیثیت تھی۔

عن عبید بن السباق مرسلاً قال	عبید بن السباق سے مرسلاً مروی ہے کہ حضور نے ایک
رسول اللہ صلعم فی جمعۃ من الجمع یا	مرتبہ جمعہ کے خطبہ میں فرمایا اے مسلمانو! اس دن کو اللہ
معشر المسلمین ان ھذا یوم جعلہ	نے عید مقرر کیا ہے۔ لہٰذا تم آج کے دن غسل کیا کرو
اللہ عیداً فاغتسلوا ومن کان عندہٗ	اور جس کے پاس خوشبو موجود ہو وہ اگر استعمال کرے
طیب فلا یضرہٗ ان یمس منہ وعلیکم	تو کیا نقصان ہے۔ اور دیکھو مسواک ضرور
بالسواک۔ (موطاء۔ ابن ماجہ)	کرو۔

ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ مجھے تمہارے حق میں سب سے زیادہ جس چیز کا خوف ہے وہ زمین کی برکات ہیں۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ زمین کی برکات سے کیا مراد ہے؟ حضور نے جواب دیا دنیا کی زینت وشوکت۔ اس پر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا بُرائی سے بھی بھلائی آتی ہے؟ حضور سن کر خاموش ہوگئے یہاں تک کہ لوگوں نے گمان کیا کہ کوئی چیز آپ پر اتر رہی ہے۔ پھر آپ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا اور فرمایا وہ سائل کہاں ہے۔ اس شخص نے کہا میں ہوں۔ آپ نے فرمایا بھلائی صرف بھلائی سے آتی ہے۔ اس دنیا کا مال بہت خوش نما اور شیریں ہے فصل بہار میں جب یہ خوب پھلتی ہے تو اسے پیٹ بھر کر کھلنے والا جانور بدہضمی سے مرجاتا ہے یا مرنے کے قریب جا لگتا ہے۔ البتہ وہ جانور بچ جاتا ہے جس نے دیکھا کہ کھاتے کھاتے کوکھیں پھیل گئی ہیں تو کھانا چھوڑ دیا، دھوپ میں چلا پھرا، کچھ جگالی کی، کچھ پیشاب اور پاخانہ کی راہ سے نکالا اور جب پیٹ خالی ہوگیا تب دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس مال کو جو شخص حق کی راہ سے لیگا اور حق کی راہ میں نکال دے گا اس کے لیے تو یہ بہترین مددگار ہے۔ اور جو حق کے بغیر لے گا۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کھاتا چلا جائے اور شکم سیر نہ ہو۔ (بخاری کتاب ارقاق وکتاب الزکوٰۃ)۔

عمرو بن تغلب کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضور کے پاس کچھ مال آیا تھا جس کو آپ نے بعض لوگوں میں بانٹ دیا۔ اور بعض کو چھوڑ دیا۔ بعد میں آپ کو معلوم ہوا کہ جن لوگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے انھیں رنج ہے۔ اس کے متعلق آپ نے خطبہ میں فرمایا کہ میں ایک شخص کو دیتا ہوں اور دوسرے کو نہیں دیتا جس کو میں نہیں دیتا وہ مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے جس کو میں دیتا ہوں۔ ایک جماعت کو دیتا ہوں جبکہ ان کے دلوں میں بے تابی اور بے چینی دیکھتا ہوں۔ اور ایک جماعت کو اُس بے نیازی اور نیکی کے حوالے کر دیتا ہوں جو اللہ نے ان کے دلوں میں پیدا کی ہے۔ (بخاری)

مشہور حدیث ہے کہ ایک شخص نماز جمعہ میں حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے

آپ نے پکار کر اس سے پوچھا اے شخص! کیا تو نماز پڑھ چکا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو اٹھ اور نماز پڑھ۔ دراصل یہ شخص پھٹے حالوں تھا۔ آپ کا مقصد یہ تھا کہ لوگ اس کی بدحالی کو دیکھ لیں۔ جب وہ نماز پڑھ چکا تو آپ نے لوگوں کو صدقہ کی ترغیب دلائی۔ اس حدیث کے اطراف قریب قریب تمام صحاح اور سنن اور مسانید میں آئے ہیں۔ امام احمد نے جو حدیث نقل کی ہے اس میں خود حضور کے یہ الفاظ منقول ہیں کہ "یہ شخص جب مسجد میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ بہت شکستہ حال ہے اس لیے میں نے اسے حکم دیا کہ دو رکعت نماز پڑھے میں چاہتا تھا کہ کوئی شخص اس کی حالت دیکھ لے اور اس کو کچھ صدقہ دیدے"۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور خطبہ دے رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص لوگوں کے اوپر سے پھاندتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ آپ نے پکار کر فرمایا بیٹھ جاؤ، تم نے لوگوں کو تکلیف دی (ابوداؤد، نسائی)

حضرت انس کی روایت ہے کہ ایک روز حضور خطبہ دے رہے تھے اور قحط سالی کا زمانہ تھا ایک شخص نے فریاد کی کہ یا رسول اللہ جانور مرگئے اور بال بچے فاقہ کر رہے ہیں۔ اللہ سے دعا فرمایئے کہ بارش ہو جائے۔ آپ نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر دعا فرمائی خدا کے فضل سے بارش شروع ہوگئی اور دوسرے جمعہ تک لگاتار جاری رہی۔ پھر دوسرے جمعہ کو آپ خطبہ دینے کھڑے ہوئے تو وہی شخص پھر اٹھا اور بولا کہ یا رسول اللہ مکان گر گئے اور مال و اسباب تباہ ہو رہے ہیں۔ خدا سے دعا فرمایئے۔ آپ نے پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر خطبہ دے رہے تھے۔ اتنے میں حضرت عثمان تشریف لائے۔ حضرت عمر نے فرمایا لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ ندا رجمعہ کے بعد نماز کے لیے آنے میں دیر کرتے ہیں۔ پھر حضرت عثمان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا یہ کونسا وقت ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں کام میں لگا ہوا تھا اذان کی آواز سنی تو گھر جانے کے بجائے وضو کر کے سیدھا یہاں چلا آ رہا ہوں۔ حضرت عمر نے یہ سن کر

فرمایا خوب! تاخیر تو تھی ہی۔ اب معلوم ہوا کہ آپ صرف وضو ہی پر اکتفا کرآئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا ہے۔ (بخاری، موطا، مسلم)

یہ ان کثیر التعداد خطبوں میں سے چند ہیں جو معتبر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے منقول ہیں اور ان کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کا خطبہ جن کے عمل متواتر کی بدولت مشروع سمجھا گیا ہے ان کے ہاں خطبہ کے معنی محض ذکر اللہ کے نہ تھے بلکہ وہ اس سے تبلیغ، تعلیم، اصلاح، ہدایت اور بہت سے قومی و شخصی معاملات کی انجام دہی کا کام لیتے تھے۔ دراصل یہ چیز اس لیے مشروع نہیں کی گئی تھی کہ لوگ ہفتہ میں ایک بار نماز سے پہلے کسی خوش رسم کی ایک چیز سن لیں جیسی مسیحی گرجاؤں میں وعظ (سرمن) کے نام سے سنائی جاتی ہے۔ بلکہ اس کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا ایک متحرک اور کارفرما پرزہ بنایا گیا تھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ہفتہ میں ایک مرتبہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کو جمع کرکے اللہ کے احکام سنائے جائیں، دین کی تعلیمات ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ ان کی جماعت میں یا ان کے افراد میں جو کچھ خرابیاں رونما ہوں ان کی اصلاح کی جائے، اور قومی فلاح و بہبود کے کاموں کی طرف انہیں توجہ دلائی جائے۔

نماز اور خطبہ کا ایک اور فرق | نماز اور خطبہ جمعہ کے درمیان ایک فرق اور بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ نماز میں جتنی چیزیں پڑھی جاتی ہیں وہ سب لفظاً لفظاً معین کر دی گئی ہیں۔ جو شخص عربی نہ جانتا ہو وہ تھوڑا سا وقت صرف کرکے بآسانی ان کا ترجمہ یاد کرسکتا ہے، یا ان کے مفہومات ذہن نشین کرسکتا ہے۔ پس نماز کے عربی زبان میں ہونے سے درحقیقت اس امر کا بھی کوئی خوف نہیں ہے کہ عربی نہ جاننے والے ان عبارات کے معنوی فوائد سے بالکل ہی محروم رہ جائیں گے جنہیں نماز میں وہ پڑھتے ہیں۔ بخلاف اس کے خطبہ جمعہ کے لیے کوئی عبارت مقرر نہیں۔ ہر جمعہ کو ایک نیا خطبہ ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ پہلے سے یاد کرلینا

یا اس کا مفہوم ذہن نشین کر کے آنا لوگوں کے لیے کسی طرح ممکن نہیں۔ پس خطبہ کے لیے عربی زبان کو لازم کر دینے کا نتیجہ قطعاً یہی ہے کہ غیر عربی داں لوگوں کے حق میں وہ محض ایک بے معنی چیز اور ایک بے جان مذہبی رسم بن کر رہ جائے، اور شارع کے وہ تمام مقاصد فوت ہو جائیں جن کے لیے اس نے جمعہ کا خطبہ مشروع کیا ہے۔ ایک معمولی عقل کا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ ترکی بولنے والوں کے سامنے سنسکرت میں تقریر کرنا اور فارسی زبان والوں کو جرمن زبان میں مخاطب کرنا محض ایک مہمل حرکت ہے پھر شارع حکیم کے متعلق یہ کیونکر گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ احکام دین کی تفہیم اور مکارم اخلاق کی تعلیم کے لیے کسی ایسی زبان میں وعظ کرنے کا حکم دیگا جس کو سامعین سمجھتے ہی نہ ہوں۔

خلاصۂ مباحث گذشتہ یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے تین باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔

ایک یہ کہ خطبہ نماز کا جز نہیں ہے، لہٰذا نماز کے لیے عربیت کے واجب ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خطبہ کے لیے بھی عربیت واجب ہو۔

دوسرے یہ کہ خطبہ کو مشروع کرنے سے شارع کے پیش نظر جس قدر مقاصد ہیں وہ سب کے سب ایسی حالت میں فوت ہو جاتے ہیں جب کہ خطبہ کسی ایسی زبان میں پڑھا جائے جس کو سامعین نہ سمجھتے ہوں بخلاف اس کے نماز جن مقاصد کیلیے شارع نے فرض کی ہے ان میں سے کوئی اہم مقصد مصلیوں کے عدم فہم سے فوت نہیں ہوتا۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ عدم فہم سے نماز میں تو محض ایک جزئی سا نقصان آتا ہے مگر خطبہ میں اس سے کلی نقصان واقع ہو جاتا ہے

تیسرے یہ کہ نماز میں عدم فہم سے جو ایک جزئی سا نقصان واقع ہوتا ہے وہ بھی بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے لیکن خطبہ میں اس سے جو کلی نقصان واقع ہوتا ہے اسے رفع کرنے کی کوئی سبیل نہیں۔

مانعین خطبۂ عربیہ کے دلائل اب ہم کو یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا خطبۂ غیر عربیہ کے جواز میں کوئی امر شرعی تو مانع نہیں ہے؟ اس سلسلہ میں جب ہم قرآن اور سنت کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو کہیں صراحۃً کیا معنی کنایۃً بھی کوئی حکم ایسا نہیں ملتا کہ خطبہ کے لیے عربی زبان ضروری ہے۔ جو لوگ عربیت کے لزوم پر

زور دیتے ہیں انہوں نے بھی کوئی آیت یا حدیث پیش نہیں کی ہے، بلکہ ان کا استدلال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ اور سلف صالح نے ہمیشہ عربی زبان ہی میں خطبہ پڑھا ہے اور کبھی خطبہ کے لیے عربی کے سوا دوسری زبان استعمال نہیں کی۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں کبھی کبھی غیر عرب بھی موجود ہوتے تھے مگر کسی روایت میں نہیں آیا کہ آپ نے ان کی تفہیم کے لیے غیر عربی میں خطبہ دیا ہو، یا عجمی زبانیں جاننے والے صحابہ میں سے کسی کو ان کی تفہیم پر مامور کیا ہو۔ حضور کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم سب سے بڑھ کر تبلیغ دین اور تذکیر و ارشاد کا جذبہ رکھتے تھے، اور ان کے عہد میں بکثرت عجمی ممالک بھی فتح ہو چکے تھے جن کے باشندے عربی نہ سمجھتے تھے۔ مگر ان بزرگوں نے بھی عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ جاری نہیں کیا۔ اسی بنا پر متقدمین اور متاخرین میں سے ایک گروہ کثیر نے یہ رائے قائم کی ہے کہ صحت خطبہ اور ادائے سنت کے لیے خطبہ کا عربی میں ہونا شرط ہے۔ صرف ایک امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ہیں جو غیر عربی خطبہ کو مطلقاً جائز رکھتے ہیں۔ ان کے سوا سلف میں اور کوئی نہیں جو اس کے جواز کا قائل ہو[1]۔

استدلال مذکور پر تنقیدی نظر ہمارے نزدیک اس استدلال میں متعدد اصولی غلطیاں ہیں۔ جو لوگ یہ استدلال پیش کرتے ہیں ان کی اولین غلطی یہ ہے کہ وہ شرعی عمل اور عادی و طبعی عمل میں فرق نہیں کرتے جس کی طرف ہم نے اپنے چوتھے مقدمہ میں اشارہ کیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان عربی تھی، آپ کے مخاطب بھی عرب تھے یا ایسے عجمی تھے جو عربی جانتے تھے۔ اگر آپ ان کے سامنے عربی میں خطبہ نہ دیتے تو اور کس زبان میں دیتے؟ نبی عربی کا اہل عرب کے سامنے عربی میں تقریر کرنا ایک طبعی فعل ہے۔ اس کو حجت شرعی بنانا کسی طرح درست نہیں۔

---

(۱) امام ابویوسف اور امام محمد رحمہما اللہ کے متعلق بعض روایات میں آیا ہے کہ وہ خطبہ کے مسئلہ میں امام اعظم کے متفق ہیں، اور بعض روایات میں یہ ہے کہ وہ صرف اس شخص کے لیے غیر عربی خطبہ کو جائز رکھتے ہیں جو عربی زبان میں خطبہ دینے پر قادر نہ ہو۔

اگر آپ نے یہ فرمایا ہوتا کہ خطبہ عربی میں دیا کرو اور کوئی دوسری زبان اس غرض کیلئے استعمال کرو تو بلاشبہ یہ ارشاد حجت شرعی ہوتا لیکن جب کہ آپ نے ایسا نہیں فرمایا تو خطبۂ عربیہ کو محض اس بنا پر "سنت" قرار نہیں دیا جاسکتا کہ حضور نے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔ اس طرح کے طبعی اور عادی افعال کو شرعی اصطلاح میں سنت قرار دینے کے تو یہ معنی ہوں گے کہ عربی زبان میں گفتگو کرنے کو بھی مسنون ٹھیرایا جائے، کیونکہ حضور نے تمام عمر اسی زبان میں کلام فرمایا ہے، اور غیر عربی میں گفتگو کرنا آپ سے ثابت نہیں۔ اس کے جواب میں اگر کوئی یہ کہے کہ آپ کا عربی میں نماز پڑھنا بھی تو ایک طبعی فعل تھا پھر تم اس کو کس بنا پر شرعی فعل قرار دیتے ہو۔ تو اس کے جواب میں ہم کہیں گے کہ نماز کے لیے عربیت کا وجوب محض اس بنا پر نہیں ہے کہ حضور نے ہمیشہ عربی میں نماز پڑھی ہے بلکہ اس طبعی عمل کے ساتھ چونکہ متعدد مصالح شرعیہ بھی موجود ہیں جن کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس لیے عربی زبان میں نماز ادا کرنا واجب قرار پایا ہے۔ بخلاف اس کے عربی نہ جاننے والے لوگوں کے سامنے عربی میں خطبہ دینا کسی مصلحت شرعی کا حامل نہیں بلکہ اس سے شریعت کے مقاصد الٹے فوت ہو جاتے ہیں، لہذا اس کو محض اس بنا پر لازم قرار نہیں دیا جاسکتا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے عربی جاننے والے لوگوں کے سامنے ہمیشہ عربی میں خطبہ دیا ہے۔

استدلال مذکور کی دوسری غلطی یہ ہے کہ اس میں زمانی حالات سے قطع نظر کر لیا گیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں جو عجمی الاصل لوگ مجالس نبویہ میں حاضر ہوتے تھے وہ زیادہ تر وہی تھے جو عربی زبان سے واقف تھے۔ اور اگر بالفرض ان میں کوئی اکا دکا شخص ایسا ہو بھی جو عربی سے ناواقف ہو تو ظاہر ہے کہ عربی بولنے والوں کے کثیر التعداد گروہ کو چھوڑ کر اس ایک شخص یا دو چار شخصوں کی خاطر خطبہ کی زبان نہیں بدلی جاسکتی تھی۔ پھر عہد نبوی کے بعد جب صحابہ کرام فتح و ظفر کے جھنڈے لے کر عجمی ممالک میں پہنچے تو ان کی حیثیت ایک حاکم قوم کی تھی۔ ان کے پاس

سیاسی طاقت تھی، وہ غالب تھے مغلوب نہ تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانے کے حاجتمند نہ تھے بلکہ دوسرے خود ان سے سمجھنے کے حاجتمند تھے۔ ان کے اندر اتنا بل بوتا تھا کہ اپنی زبان کو دوسرے ملکوں میں پھیلا دیں، اور درحقیقت انہوں نے بخارا سے لے کر اسپین تک اسے پھیلا کر ہی چھوڑا حتیٰ کہ ان کے فتح کردہ اکثر و بیشتر ممالک کی اصلی زبانیں عربی زبان کے مقابلہ میں قریب قریب فنا ہوگئیں۔ پھر ان کو کیا ضرورت تھی کہ اپنی زبان کو چھوڑ کر مفتوح قوموں کی زبانوں میں خطبے دیتے لیکن آج وہ حالت نہیں ہے۔ مدتیں ہوئیں کہ عربیت کا غلبہ ختم ہوچکا ہے۔ دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک میں اب صدیوں سے عربی زبان کا چرچا نہیں اور سیاسی و علمی ضعف کی بنا پر روز بروز کم ہوتا جارہا ہے عربیت کے پاس اب وہ طاقت ہی نہیں ہے جس سے وہ پھیلے اور زبانوں پر چھا جائے۔ اس کمزوری کی حالت میں اس طرز عمل پر اصرار کرنا کیونکر درست ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام اور ان کے قریب العہد لوگوں نے غلبہ و طاقت کے عہد میں اختیار کیا تھا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ سلف صالح نے جو رائے حالات کے اثر سے قائم کی تھی اس کو شرعی معنوں میں اجماع کی حیثیت دی جارہی ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر عرض کرچکے ہیں صدر اول کے تمام اکابر فاتح قوم کے لوگ تھے۔ اگرچہ اسلام نے ان کو وطنی اور نسلی اور لسانی عصبیتوں سے پاک ضرور کردیا تھا، مگر یہ کیونکر ممکن تھا کہ ان کے اندر وہ کیفیات پیدا نہ ہوتیں جو طبعاً ہر فاتح قوم میں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا مفتوح قوموں کی زبانوں سے نفرت کرنا اور اپنے آپ کو ان کی بولیوں سے بچانا، اور ان کے اندر اپنی زبان پھیلانے کی کوشش کرنا ایک طبعی امر تھا اور غلبہ وطاقت کی فطرت ہی اس کی مقتضی تھی کہ یہ بات ان میں پیدا ہو۔ اس پر مزید یہ کہ ان کی زبان قرآن اور سنت کی زبان تھی۔ اسلام کا سارا سرمایہ اسی زبان میں تھا۔ اسلام کی اصلی اسپرٹ کا تحفظ خالص عربیت کے تحفظ ہی پر موقوف تھا۔ اس چیز نے ان کے اندر زبان کی حد تک عربیت کا تعصب اور بھی زیادہ پیدا کردیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکابر سلف کسی حال میں بھی عجمی زبان بولنے کو پسند نہ کرتے تھے حتی کہ عجمی الفاظ

کا استعمال بھی ان کو گوارا نہ تھا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ لا تتعلموا رطانۃ الاعاجم "عجموں کی بولی نہ سیکھو"۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مرتبہ نوروز کا ہدیہ پیش کیا گیا۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ہے۔ عرض کیا گیا، آج نوروز ہے۔ آپ نوروز کا لفظ سن کر چیں بجبیں ہو گئے۔ محمد بن سعید بن ابی وقاص نے ایک جماعت کو فارسی بولتے سنا تو کہنے لگے ما بال المجوسیۃ بعد۔ امام احمد سے پوچھا گیا کہ عجمی زبان میں دعا کرنا کیسا ہے۔ فرمانے لگے لسان سوء "بری زبان ہے"۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ نہ عجمی زبان میں دعا مانگو، نہ قسم کھاؤ۔ امام شافعی عربی زبان کے سوا ہر دوسری زبان میں بات چیت کرنے کو مکروہ قرار دیتے تھے۔ یہی حال اس زمانے کے اکثر فقہا کا تھا۔ وہ عجمی زبان کے استعمال کو عموماً اور دعا و ذکر میں اس کے استعمال کو خصوصاً برا سمجھتے تھے۔ ان بزرگوں کے اس طرز عمل پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ کسی شرعی بنیاد پر نہ تھا بلکہ ایک بڑی حد تک اس طرز عمل کی بنا فطری اسباب پر تھی، اور حالات کی طاقت نے ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ ورنہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ اسلام کو وطنی اور لسانی عصبیت سے کوئی علاقہ نہیں۔ وہ کسی خاص قوم کا مذہب نہیں ہے۔ نہ وہ اس لیے آیا ہے کہ کسی خاص زبان کی حمایت کرے اور ایک ہی زبان بولنے والوں کا دین بن کر رہ جائے۔

بزرگان سلف نے عجمی زبانوں کی کراہت اور ان سے اجتناب اور دینی و دنیوی اغراض کے لیے ان کے استعمال کی ممانعت پر جو زور دیا تھا اس کا ایک سبب اور بھی تھا۔ صدر اول کی تاریخ پر نظر ڈالیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس زمانہ میں عرب کے سوا دوسری قومیں عموماً غیر مسلم تھیں اور اسلام زیادہ تر عربی قوم ہی میں تھا۔ اس صورت حال نے عربیت کو اسلام کا اور عجمیت کو کفر کا ہم معنی بنا دیا تھا۔ عجمی قوموں کے جو افراد اسلام لاتے تھے ان کا رشتہ ملت کفر سے توڑنے اور ملت اسلام میں ان کو جذب کرنے کے لیے ناگزیر تھا کہ ان کو عربیت کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی جاتی، اور ان کی

معاشرت، لباس، آداب و اطوار، بول چال ہر چیز کو بدل ڈالا جاتا، کیونکہ باطنی تغیر کی تکمیل خارجی تغیر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اگر ان کو محض مسلمان بنا کر چھوڑ دیا جاتا اور تمدنی، لسانی، ادبی حیثیت سے وہ بدستور کافر اقوام کا جزو بنے رہتے تو کفر کے سمندر میں اسلام کے یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے پیدا ہونے کے ساتھ ہی فنا بھی ہونے لگتے۔ یہ حالت ایک طویل مدت تک رہی۔ اس کے بعد جب دوسرے ممالک کی بڑی بڑی قومیں مسلمان ہو گئیں تو عربیت اور اسلام کا وہ ترادف جو ابتدائی صدیوں میں تھا، باقی نہ رہا۔ اب ترکی، فارسی، اردو اور دوسری مسلمان قوموں کی زبانیں کفار کی زبانیں نہیں بلکہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں۔ اب عربی لباس اور عربی طرز معاشرت بھی لازمی طور پر شعار اسلام نہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا جو عام لباس ہے وہ بھی اسی طرح شعار اسلام ہے جس طرح عربی لباس ہے۔ علی ہذا القیاس دوسرے اسلامی ممالک میں بھی جس لباس اور جس طرز معاشرت سے مسلمان غیر مسلموں کے مقابلہ میں ممیز ہوتے ہیں وہ یقیناً اسلامی شعار ہی ہے پس اب حالات کے بدل جانے کے باوجود فقہائے اسلام کا عربیت پر اس طرح زور دینا درست نہیں جس طرح صدر اول کے فقہاء بالکل مختلف حالات میں زور دیتے تھے۔ ہمارے نزدیک متاخرین کی ایک یہ اصولی غلطی ہے کہ وہ متقدمین کے زمانے اور ان کے حالات کو نہیں دیکھتے اور آنکھیں بند کر کے ان کے اقوال سے استناد کرنے لگتے ہیں۔

ایک اور دلیل خطبۂ عربیہ کے لزوم پر ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ خدا کا کلام اور اسلام کے تمام احکام زبان عربی میں ہیں اور ہر مسلمان پر عربی سے واقف ہونا لازم ہے۔ اگر لوگ عربی کی تحصیل میں غفلت کرتے ہیں اور عربی نہیں سمجھتے تو یہ ان کا قصور ہے۔ ان کی خاطر خطبہ کی زبان بدل لینا کیا ضرور!

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے عربی زبان سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر انہیں دین کی سمجھ حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور ان میں گمراہیوں کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ علم دین کے اصل ماخذ تک ان کی رسائی نہیں۔ ہم نے بارہا اس ضرورت کا اظہار کیا ہے اور ہماری قطعی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم میں عربی

زبان کو لازمی طور پر شامل ہونا چاہیے لیکن "ہے" اور "چاہیے" میں بہت فرق ہے۔ جو کچھ ہونا چاہیے اس کے لیے ضرور کوشش کیجیے۔ مگر جو کچھ فی الواقع ہے اس سے آنکھیں بند نہ کیجیے۔ شریعت نے آپ کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ بس "چاہیے" کے پیچھے پڑے رہیے اور واقعات کی پروا نہ کیجیے۔ آپ کے حالات تو یہ ہیں کہ آپ مسلمانوں کے لیے عربی زبان تو درکنار دین کی ابتدائی تعلیم بھی لازمی نہیں کرا سکتے اور اس پر آپ کے تحکم کی یہ کیفیت ہے کہ مسلمان اگر عربی نہیں سمجھتے تو آپ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس کی پروا نہیں، ہم تو عربی ہی میں خطبہ سنائیں گے۔ کیا عربی خطبہ پر آپ کے اصرار کا یہ نتیجہ نکلنے کی کوئی امید ہے کہ مسلمان محض اس کو سمجھنے کے لیے عربی زبان سیکھنے پر مجبور ہو جائیں؟

تیسری دلیل | تیسری دلیل جو پیش کی جاتی ہے وہ نسبتاً زیادہ وزنی ہے۔ یعنی یہ کہ عربی زبان کے سوا دوسری زبانوں میں خطبہ کے جاری ہونے سے اسلام میں لسانی قومیتوں کی بنا پڑنے کا خوف ہے۔ جمعہ تو تمام مسلمانوں کو بلا لحاظ نسل و زبان و وطن ایک جگہ جمع کرنا چاہتا ہے، مگر غیر عربی خطبہ ان کو چھانٹ دیگا اور مختلف زبانیں بولنے والوں کے جتھے الگ الگ کر دیگا۔ یہ خطرہ یقیناً اہمیت رکھتا ہے مگر اس کا علاج کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ ہونا یہ چاہیے کہ خطبہ کا ایک حصہ تو لازماً عربی زبان میں ہو، اور اسے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحاب پر صلاۃ و سلام، اور آیات قرآنی کی تلاوت کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ اس کے بعد دوسرا حصہ جس میں احکام اور مواعظ اور ضروریات زمانہ کے لحاظ سے اسلامی تعلیمات ہوں، ایسی زبان میں ہونا چاہیے جس کو حاضرین یا ان کی اکثریت سمجھتی ہو، اور اس غرض کے لیے بھی زیادہ تر ان زبانوں کو ترجیح دی جانی چاہیے جو بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہوں، مثلاً ہندوستان میں صوبہ وار زبانوں اور مقامی بولیوں کے بجائے زیادہ تر اردو زبان کا خطبہ ہونا چاہیے کیونکہ اسے قریب قریب ہر صوبہ کے مسلمان سمجھتے ہیں۔ البتہ دور دراز کے گوشوں میں جہاں اردو سمجھنے والے کم ہیں مقامی زبانوں کو خطبہ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن جہاں مسلمانوں کا بین الاقوامی اجتماع ہو وہاں عربی کے سوا کسی دوسری زبان میں خطبہ نہ ہونا چاہیے۔

عملی مشکلات | یہاں تک جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے وہ صرف شرعی مسئلہ سے متعلق تھا، یعنی قانون کی حد تک ہمارے

نزدیک غیر عربی خطبہ میں کوئی حکم شرعی مانع نہیں ہے اور جو لوگ اس کو ناجائز یا مکروہ تحریمی یا خلاف سنت قرار دیتے ہیں، وہ ہماری رائے میں غلطی کرتے ہیں لیکن اس مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ احکام سے نہیں بلکہ ان کے نفاذ کی عملی صورت سے تعلق رکھتا ہے۔

عام فہم زبان میں خطبہ ہونے کی ضرورت جس بنا پر ظاہر کی جاتی ہے وہ تو یہی ہے کہ لوگ جب اس کو سمجھیں گے تو فائدہ اٹھائیں گے گویا اصل مقصود سمجھنا نہیں بلکہ فائدہ اٹھانا ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہونے لگے، تو ایسی صورت میں غالباً ہر صاحب عقل یہی کہے گا کہ ایسے سمجھنے سے نہ سمجھنا بہتر ہے۔ اب ذرا اپنی قوم کی حالت کا جائزہ لیجیے

آپ کے ہاں امامت کا معیار حد سے زیادہ پست ہو چکا ہے جو منصب مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں سب سے زیادہ اہم تھا وہ اب سب سے زیادہ غیر اہم ہے۔ جس منصب کیلیے بہتر سے بہتر آدمی منتخب کرنے کا حکم تھا۔ اب اس کے لیے بدتر سے بدتر آدمی چھانٹا جاتا ہے مسلمانوں کے ذہن میں اب امام کا تصور یہ ہے کہ جو شخص دنیا کے کسی اور کام کا نہ ہو اس کو مسجد کا امام ہونا چاہیے دس پانچ روپیہ تنخواہ اور دونوں وقت کی روٹی مقرر کر دی اور کسی نیم خواندہ ملا کو رکھ لیا۔ یہ گویا مسجد کی امامت کا انتظام ہو گیا! امامت کو اس درجہ پست کر دینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مسجدیں وہی مسجدیں جنہوں نے کبھی ہماری قوم کے قصر فلک بوس کی تعمیر کی تھی، آج ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہیں جو بے علم، تنگ نظر، پست حوصلہ اور دنی الاخلاق ہیں کیا آپ ان لوگوں سے امید رکھتے ہیں کہ یہ اردو میں خطبے دیکر آپکی دینی و دنیوی رہنمائی کر سکیں گے۔

اس گروہ کو چھوڑ کر اگر آپ نے جمعہ کی امامت کے لیے کسی دوسرے گروہ کا انتخاب کرنا چاہا تو لامحالہ اس کے لیے آپ کو علماء ہی کے طبقہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور باستثنا چند اس طبقہ کے سواد اعظم کا جو حال ہے اسے بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے۔ ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیے کہ آئے دن مسجدوں میں سر پھٹول ہوگی، اس لیے کہ ان میں کا ہر شخص اپنا ایک الگ مشرب رکھتا ہے اور اپنے مشرب میں وہ اتنا سخت ہے کہ دوسرے مشرب والوں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت کرنا اس کے نزدیک گناہ سے کم نہیں، پھر اللہ نے اس کی زبان میں ایک ڈنک رکھ دیا ہے جس سے دلوں کو زخمی کیے بغیر وہ کوئی

بات نہیں کر سکتا۔ وہ جس ماحول سے تعلیم و تربیت پا کر آتا ہے اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ تمام دلچسپیاں سمٹ کر چند چھوٹی چھوٹی نزاعی باتوں میں جمع ہو گئی ہیں اس لیے لامحالہ وہ جب زبان کھولے گا انہی مسائل پر کھولے گا اور نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ کے گھر میں گالم گلوچ اور جوتی پیزار ہوگی، اور آخر کار ہر مشرب کے مسلمان اپنے جمعے الگ الگ قائم کرنے لگیں گے۔ یہ تو مذہبی ذہنیت رکھنے والوں کا حال ہوا۔ رہے نئے تعلیم یافتہ حضرات جو ان مسائل سے دلچسپی نہیں رکھتے، تو ان پر ایک دوسری مصیبت نازل ہوگی۔ وہ ہر جمعہ کو رسول اللہ کے منبر پر سے وہ وہ جھوٹی روایتیں اور لاطائل کہانیاں اور احکام اسلامی کی غلط تعبیریں سنیں گے کہ جن کو سن کر غیر مسلموں کا مسلمان ہونا تو در کنار، ذی ہوش مسلمانوں کا مسلمان رہنا بھی مشکل ہے۔

خطبۂ غیر عربیہ کے اجراء سے پہلے آپ کو ان خرابیوں کا کوئی علاج سوچنا چاہیے۔ میری رائے میں ان کا علاج صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اہل علم کی کوئی معتدل جماعت خطبات جمعہ کی تیاری کا کام اپنے ہاتھ میں لے اور ایسے خطبے لکھے جو نزاعی مسائل سے پاک ہوں اور مسلمانوں میں صحیح دینی روح پھونکنے والے ہوں پھر ہندوستان میں ہر جگہ صحیح الخیال اور با اثر لوگ کوشش کریں کہ اسی مرکزی جماعت کے تیار کیے ہوئے خطبے نماز جمعہ میں پڑھے جائیں۔ اگر ایسی کوئی تنظیم ہو جائے (جس کی امید کم ہی نظر آتی ہے)، تو خطبۂ غیر عربی کے اجرا میں میری تحقیق کی حد تک کوئی امر شرعی مانع نہیں ہے لیکن اگر یہ تنظیم نہ ہو سکے تو مصلحت کا اقتضا یہی ہے کہ عربی کے انہی پرانے خطبوں کو چلنے دیا جائے جن سے کوئی مفید نہیں تو مضر نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا۔ البتہ اگر کہیں خوش قسمتی سے کوئی موزوں خطیب میسر آجائے اور وہ اس خدمت کو باحسن وجوہ انجام دے سکے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں دریغ بھی نہ کرنا چاہیے۔
